مینائے غزل



شیر فاروق



بشیر فاروق

مینائے غزل

مجموعۂ کلام

بشیر فاروق

مکتبۂ لالہ زار
چیپ جون بلڈنگ۔ الفنسٹن اسٹریٹ۔ کراچی

ناشران :- مکتبۂ لالہ زار، جیپٹن بلڈنگ الفنسٹن اسٹریٹ کراچی

مطبع :- ریپبلکا پرنٹنگ پریس - صدر کراچی

کتابت :- مرکزِ کتابت - فتومل بھگوانداس بلڈنگ،
دریالال اسٹریٹ، جوڑیا بازار - کراچی -

قیمت

تین روپے

نومبر ۱۹۵۸ء

مینائے غزل

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ یہ بھی ہے حرام اے ساقی
"اقبال"

انتساب

میں اپنے افکارِ معنوی کی اس متاعِ عزیز کو اپنے والدِ ماجد عالیجناب عبد الرحمٰن صاحب مدظلہٗ کے نامِ نامی سے معنون کرتا ہوں، جن کے سایۂ عاطفت میں مَیں نے زندگی کی ابتدا کی اور ترقی کے مدارج میں قدم رکھا اور اس قابل ہو سکا کہ گلشنِ شعر و ادب میں گلچینی کی سعادت حاصل کر سکوں۔

بشیر فاروق

جگرؔ مراد آبادی

تجزیہ

"بشیر فاروق صاحب" کا مجموعۂ کلام زیرِ طباعت ہے، ایک شاعر کے کلام کے مطالعے سے پیشتر خود شاعر کا مطالعہ ضروری سمجھتا ہوں۔ عزیز موصوف سے مراسم تو دیرینہ تھے لیکن متواتر و مسلسل ملاقاتوں کے مواقع اب سے پیشتر میسّر نہیں ہو سکے تھے، یہ پہلا اتفاق ہے کہ میں نے قریب سے انھیں دیکھا۔ وہ ایک صاحبِ فکر و نظر جوان العمر شاعر ہیں، ملک و ملّت کے درد سے بھی آشنا، واقعتہً وہ ایک شریف النفس انساں ہیں۔ اور ان کے شعر و ادب میں ان کی تمام خصوصیاتِ مزاجی پوری طرح نمایاں ہیں۔ میں نے ان کے کلام کا مطالعہ سرسری طور پر کیا ہے، وہ خود ایک صحت مند و صالح انسان ہیں، اس لئے ان کے کلام میں بھی صحت و صالحیت واضح اور روشن ہے۔ شعری محاسن میں نے ان کے کلام میں بدرجۂ اتم محسوس کئے تیز رفتاری سے ان کے قدم ترقی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبلِ قریب میں ایک معیاری شاعر ثابت ہوں گے۔

جگرؔ مراد آبادی

۱۹ مارچ ۶۷ء

رئیس امروہوی

پیش لفظ

اِدھر چند سال سے اُردو شعر و ادب کا ایک حلقہ مسلسل اِس تشویش میں مبتلا ہے کہ "اَدب جمود سے دوچار ہے"۔

اِس موضوع پر ہمارے ادب کے چند مستند نقادوں نے اِتنی بار اور اِس قدر اِصرار سے لکھا ہے کہ واقعی ہم سب یا ہم میں سے اکثر لوگ اس وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ واقعی اُردو اَدب آج ایک ناقابلِ حَل جمود سے دوچار ہے اَور یہ کہ حصولِ آزادی کے بعد اُردو اَدب میں کوئی ایسی تخلیقی چیز وجود میں نہیں آئی جسے ہم فخر کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کر سکیں۔

جُمود کا سبب کیا ہے؟

ان حضرات کے خیال میں شعر و اَدب کے جمود کا سبب وہ سیاسی اور معاشی حَالات ہیں جو تقسیم کے بَعد دونوں ملکوں یعنی پاکِستان اور بھارت میں رونما ہو گئے ہیں۔ جہاں تک بھارت میں اُردو ادب کی رَفتار کا تعلق ہے تو فی الحال مسئلے کا یہ

پہلو ہماری گفتگو سے خارج ہے۔ اِس وقت ہم اپنی گفتگو پاکستان کی ادبی و شعری تخلیقات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں، ایمانداری اور اخلاص کے ساتھ ہماری رائے یہ ہے کہ اُردو ادب میں جمود و تعطّل کا نعرہ اُن لوگوں نے بلند کیا ہے جو اپنے ذہن اور فکر کو اس نوزائیدہ مملکت اور قوم کے تصوّرات اور نظریات کے سانچے میں نہیں ڈھال سکے ورنہ آج جتنے توجہ طلب مسائل ہمارے سامنے ہیں حصولِ آزادی سے قبل ہرگز نہ تھے، آج ہر مسئلہ شاعر اور ادیب کو چیخ چیخ کر اظہارِ خیال کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی فن کار اقتضائے احوال کو محسوس نہ کرے یا محسوس کرے تو کچھ کہنا اور کرنا نہ چاہے۔

پچھلے دس سال کے اندر پاکستان میں شعری و ادبی تخلیقات کا جو ذخیرہ وجود میں آیا ہے ہم نے جب بھی اُس کا جائزہ لیا، یہ محسوس کیا کہ ادب کے مختلف دائروں اور شعر کی مختلف انجمنوں میں اس سے زیادہ کام ہوا، جس کی توقع رکھی جاسکتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ایک خاص مکتبۂ فکر اور مخصوص طبقۂ خیال کے ادبی اور فکری نمائندوں کا تخلیقی جوشِ عمل پاکستان میں کسی قدر سست پڑ گیا ہے، اور اس کے لئے "معقول نظریاتی جواز" بھی موجود ہے لیکن اس کا اطلاق دوسرے شعراء پر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات طے ہے! میں نے تمہید میں خاص طور پر اس لئے یہ بات چھیڑی کہ جناب فیض احمد فیضؔ نے سیف الدین سیفؔ کے منظوم مجموعے "خمِ کاکُل" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ پچھلے دس پندرہ برس میں ہمارے افقِ ادب پر کئی درخشاں ستارے اُبھرے جو آئندہ چل کر سیّارے ثابت ہوئے۔ چنانچہ اب کسی نئے شاعر کے نسبت خوش آئند پیش گوئی کچھ

بے سُود سی بات معلوم دیتی ہے، مَیں فیض صاحب کی اِس رائے سے متفق ہوں، اور میرے خیال میں افق ادب کے وہ درخشاں ستارے جو آئندہ چل کر آوارہ گردسیارے ثابت ہُوئے وہی تھے جو پاکستان کے نئے نظریاتی نظامِ شمسی میں داخل ہو کر راہ بھٹک گئے اور فضا میں بھٹکتے بھٹکتے اپنی ساری روشنی اور توانائی ضائع کر بیٹھے۔

بشیر فاروق کا نام ادبی دنیا میں بہت سے لوگوں کے لئے اجنبی ہے اجنبی ہونا بھی چاہیئے۔ جو شخص شعر کہنے کی خوش آیند اور صحت مند صلاحیتوں کے باوجود شعر کہنا چھوڑ دے اور مسلسل دس سال تک اپنی ذہنی قوتوں اور وجدانی توانائیوں کو خاموش جوالا مکھی کے آتشیں لاوے کی طرح اپنے سینے میں دبائے بیٹھا رہے اور پھر یکایک شعر کہنا شروع کر دے تو لوگوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اُسے بھول جائیں اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے کو پہچنوائے۔ کئی سال سے میں "بشیر فاروق" کو جانتا ہوں لیکن یہ بات میں نے تقریباً ایک سال سے جاننی شروع کی ہے کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں اور شعر بھی ایسا جسے بہ صمیمِ قلب سُنا جائے اور بخلوصِ تمام سَر دُھنا جائے۔

آج جو مجموعۂ کلام (مینائے غزل کے خوبصورت نام سے) آپکی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے یہ صرف ایک سال کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس لئے بشیر فاروق نے اپنے شعری جسم سے بے عملی اور خاموشی کی جھول کیچلی ایک سال قبل اُتاری ہے۔ وہ پہلے گاہے گاہے شعر گنگنایا کرتے تھے، اب مستقلاً کہتے ہیں، لیکن ایک سال میں بھی اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے میرے خیال میں وہ اس زمانے کے متعدد صفِ اوّل کے شعراء کی کئی سال کی تخلیقی کاوشوں

کا ہم پلّہ ہے اگر اس سے بہتر نہیں۔

میں اس بات کا قائل نہیں کہ غیب سے مضامین خیال میں آتے ہیں[1]، ہر چند کہ غالبؔ کی طرح میں بھی صریرِ خامہ کو "نوائے سروش" سے تعبیر کرتا ہوں لیکن میرے خیال میں اس نوائے سروش کا آشیانہ شاعر کے وہ انفرادی ذہنی تجربات ہوا کرتے ہیں جن سے وہ زندگی کے مختلف مراحل میں دوچار ہوتا ہے، جبلّت، وجدان، خارجی ماحول، معاشی حالات، روحانی میلان، ذاتی خصوصیات اور فطری توفیق و استعداد غرض مختلف محرکات و مؤثرات ہیں جو فن کار کے ذہن میں کسی فنی تخلیق کیلئے خام مواد فراہم کرتے ہیں۔ ہم کسی شاعر کے ذہن کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ اُس کے گرد و پیش کے حالات کا تحقیقاتی اور نفسیاتی جائزہ نہ لے لیں، روحِ عصر ہمیشہ سرگرمِ عمل رہی ہے (اور مجھے اعتراف ہے کہ روحِ عصر کی اصطلاح بہت زیادہ تشریح طلب ہے) ہر دور میں اُس کے مادّی اور روحانی رُوپ مختلف ہوتے ہیں، ہر عہد کے باقی رہنے والے ادب پر اُس کے زمانۂ پیدائش کی اَنمٹ چھاپ ہوتی ہے، کبھی یہ چھاپ گہری ہوتی ہے اور کبھی ہلکی —— لیکن یہ بات ناممکن ہے کہ اچھا ادب اور اچھا شعر مجہول النسب ہو۔

بشیر فاروق کا شاعرانہ ذہن اپنے عہد کی روحانی اور مادی خصوصیات سے متاثر ہوا ہے اور ان کے کلام پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ

---

[1] آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

شعر کن حالات اور کن حادثات کے زیرِ اثر کہے ہیں؟

میں سب سے پہلے اُن کی غزل کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

وہ لوگ خود مر گئے، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ غزل جاں بحق تسلیم ہو چکی ہے اور اگر اُن میں سے چند اب تک نیم جانی کی زندگی بسر کر رہے ہوں گے تو شاید انھوں نے تسلیم کر لیا ہو گا کہ اصنافِ ادب میں غزل کس قدر سخت جان اور ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی رُو سے بقائے اصلح کی کسوٹی پر کس قدر پوری اُترتی ہے؟ بے شک جب انسان مر جائے گا غزل مر جائے گی، لیکن ابھی انسان کہاں مرا ہے؟ غزل کیا ہے؟ غزل عشق و محبت کی اُن روایات کے اعادہ و تکرار کو نہیں کہتے۔ جن کا تجربہ صرف مجنوں اور فرہاد نے اپنے زمانے میں کیا تھا۔ جس طرح بشیر فاروق کا عشق ان کا اپنا عشق ہے، اسی طرح ان کی غزل بھی ان کی اپنی غزل ہے۔ میرا یہ شعر ہے۔

یا رب غمِ عشق کیا بلا ہے؟
ہر شخص کا تجربہ نیا ہے

یقیناً دنیا میں ہر شخص کے تجرباتِ روح ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، گو وہ بظاہر یکساں نظر آئیں، غزل انفرادی، ذہنی تجربات کے منظوم و موزوں اظہار کا نام ہے، انفرادی ذہنی تجربات بڑے گوناگوں اور رنگا رنگ ہو سکتے ہیں۔ شاعر کی نظر جس قدر رسا اور اس کا مشاہدہ جس قدر حقیقت پسندانہ ہو گا اس کے ذہنی اور وجدانی تجربوں کی کیفیت اُسی قدر شفاف اور لطیف ہو گی، شاعر کے لئے یہی ضروری

نہیں کہ وہ صرف اپنے ہی وجدان و شعور کا کما حقہٗ تجزیہ کر سکتا ہو بلکہ اُس کا مشاہدہ ہمہ گیر اور اس کی اُنگلیاں حیاتِ اجتماعی کی نبض پر بھی رہنی چاہئیں تا کہ وہ صحیح معنی میں روحِ عصر کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار رکھ سکے۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ غمِ جاناں کی آگ انسانی ذہن کو پگھلا کر کسی شخص کی رُوح میں سوز و گداز کی وہ استعداد پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ سوختگانِ عالم یا "غمِ دوراں" کی اجتماعی تپش کو محسوس کر سکتا ہے۔ بھرپور غزل وہ ہے جس میں یہ دونوں چیزیں یعنی غمِ جاناں اور غمِ دوراں (کیونکہ یہ دونوں انجامِ کار لازم و ملزوم ہیں) بیک وقت اور پہلو بہ پہلو موجود ہوں۔ زندہ شعر کہنے کے لئے بڑے "کربِ نہانی" کی ضرورت ہے۔

حقیقت کیا ہے اس کربِ نہاں کی!
یہ قیمت ہے تو کس جنسِ گراں کی؟

فن کار کے ذہن میں یہ اندرونی کرب بڑے عجیب بلکہ متضاد شخصی اور اجتماعی تجربات کے بعد پیدا ہوتا ہے اور بیچارے شاعر کے "تنِ زار" میں جب سیروں لہو خشک ہو جاتا ہے، تب کہیں ایک مصرعِ تر کی صورت نظر آتی ہے۔

بشیر فاروق کی غزل غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی آگ سے دہکی ہوئی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ ان کی جوانی کس کے کوچے میں بسر ہوئی (اور ہوئی بھی یا نہیں) اور نہ مجھے پتہ ہے کہ شخصی طور پر اُن کا محبوب کون ہے؟ لیکن مَیں نے ان کی غزلوں میں جو اُن کے محبوب کے خد و خال دیکھے تو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ؎

"ہے پرے سرحدِ ادراک سے انکا محبوب"

بشیر کو اپنے عوام سے عشق ہے، اپنی قوم سے محبت ہے، اپنی مملکت سے الفت ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اُن اَخلاقی اقدار اور صحت مند سماجی روایات کا دلدادہ ہے، جو بڑے شاندار تسلسل کے ساتھ ہمارے حال کو ماضی سے وابستہ کرتی ہیں اُس نے اپنی غزل میں بلکہ اپنے پورے کلام میں اسی عشق کی نغمہ سرائی یا اگر آپ مناسب سمجھیں تو نوحہ خوانی کی ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ بہت جلد رسمی زلف و عارض کے چکر سے نکل گئے اور انھوں نے انسانیت کے غم کو اپنا لیا اور ایسا تھا بھی ناگزیر ورنہ عمر بھر ؎

زلف نے الجھن میں الجھن ڈال دی
ہم نے یہ دیکھا تو گردن ڈال دی

جیسے مطلع ارشاد فرماتے رہتے۔ مگر ہاں ابھی بشیر فاروق کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے، اُن کی شاعرانہ شخصیت کا تعین کرنے کے لئے ہمیں اس عہد کے چند شعراء (ظاہر ہے کہ سب کا احاطہ اور سب کا تذکرہ مشکل ہے) کے تخلیقی کارناموں کی طرف اشارہ کرنا پڑے گا، کون ہیں یہ چند شعراء؟ میرے خیال میں یہ بات زیادہ مناسب ہوگی کہ عہدِ نو کے ان دو تین غزل گو شاعروں کا ذکر کیا جائے جن کا نام بار بار لیا جاتا ہے، ہم اپنے محترم دوستوں فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کا ہی ذکر کیوں نہ کریں اور ہاں سید عبدالحمید عدم کا بھی، جن کی رنگیں نوائی اور سرشار بیانی بجائے خود ایک کیفیت رکھتی ہے۔ فیض احمد فیض کے دو مجموعے اب تک ہماری نظر سے گذر چکے ہیں۔

نقشِ فریادی اور دستِ صبا، نقشِ فریادی کا خیر مقدم بھی اَدبی دُنیا میں گرمجوشی کے ساتھ کیا گیا تھا، لیکن دستِ صبا کو جو شہرت اور پبلسٹی ملی ہے اس کا عشرِ عشیر بھی نقشِ فریادی کو نہ مِل سکا۔ "دستِ صبا" بڑے ڈرامائی حالات میں پیش کی گئی تھی، اور کون نہیں جانتا کہ ڈرامہ عام طور پر لوگوں میں سنسنی کی لہر دوڑا دیا کرتا ہے "دستِ صبا" زنداں کی تخلیق ہے۔ زِنداں کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر شعر کہنا اور دیوان لکھنا بلا شبہہ بڑا سنسنی خیز عمل "(؟) ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس ڈرامائی پس منظر کے علاوہ اور کس اعتبار سے یہ کتاب اُردو ادب میں دستاویزی اہمیت رکھتی ہے؟ ——

غزل کے اعتبار سے اُردو زبان گراں مایہ زبان ہے، اِنتہا ہے کہ شعر کے اس مخصوص میدان میں ہم نے فارسی شعراء کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے جن سے ہمارے بزرگوں نے ابتدائی فیضان حاصل کیا تھا، بے شک بعض خاص شرائط کے ساتھ آج اُردو زبان کی غزل دُنیا کی ہر زبان کی عشقیہ شاعری سے فوقیت رکھتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ محترم فیض صاحب کی غزلیات اُردو ادب کی دُنیا میں کسی نئی صدی کا آغاز کرتی ہیں؛ غالبؔ نے دُنیائے غزل کے ایک عہدِ نو کا اِفتتاح کیا مومنؔ بھی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں، داغؔ بھی اِصرار کے ساتھ اس کے مُدعی ہو سکتے ہیں اور حالیؔ بھی، اِقبالؔ بھی اور حسرتؔ موہانی بھی، کیا فیض صاحب کی "دستِ صبا" اُردو غزل کی قدیم زندہ روایات اور اُس کی تاریخی عظمت و اہمیت کی حامل ہے؟ مَیں جنابِ فیض کی شخصیت کے احترام آمیز اعتراف کے ساتھ جواب دوں گا کہ نہیں۔ فیض صاحب کے کلام میں مجموعی طور پر چند بہت خوبصورت

لفظ اور بعض دل کش ترکیبیں اور نشستیں ملتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسالیب بیان میں ایک خاص قسم کی جدت اور تازگی پیدا کرنے کے درپے ہیں۔ یہ اُن کی انفرادیت اور ذہنی اُپج کی علامت ہے لیکن کوئی اُپج بھی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ ادب کی مُسلّمہ روایات کے تسلسل اور اُن کی پابندی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ شعر کی روایت ایک دن میں نہیں بنتی، صدیوں کے تہذیبی، لسانی اور وجدانی تجربوں کے بعد بعض الفاظ، بعض تراکیب، بعض قرائن، بعض کنائے اور بعض اسالیب وجود میں آتے ہیں، جب تک ہم اُن سے بہتر "لغت" اور "جامع الانشاء" ایجاد نہ کرلیں ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان میں اجتہاد اور تصرف کریں، مرزا بیدل جیسا مجتہد اور عہد ساز شاعر تو یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے لئے ایک نئی زبان تخلیق کرے لیکن اگر کوئی دوسرا اِس امتیاز کا مستحق بننا چاہتا ہے تو اُسے بیدل جیسا ذہن پیدا کرنا پڑے گا۔ میں دستِ صبا اور نقشِ فریادی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فیض احمد فیض دلکش ہلکی پھلکی غزلیں (جو اردو میں بہ کثرت ہیں) تو کہہ سکتے ہیں لیکن ان سے عام طور پر تغزل کے میدان میں کسی عظیم کارنامے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

احمد ندیم قاسمی کی غزل، فیض کے مجموعۂ کلام کی نسبت زیادہ بامعنیٰ اور بااصول ہے۔ فیض صاحب کے ذہن میں شعر گوئی کی تخلیقی تحریک جب بیدار ہوتی ہے تو اُن کی توجہ غالباً اس بات پر مرکوز رہتی ہے کہ جو مضمون وہ نظم کرنا چاہتے ہیں وہ نظم ہو جائے۔ اگر "اظہارِ خیال" کے لئے مناسب الفاظ میسر آجائیں (اور اکثر آجاتے ہیں) تو فبہا۔ نہ آئیں تو نہ سہی۔ انھیں

یقیناً یہ چیز معلوم ہے کہ اُردو کی دُنیائے غزل میں الفاظ کے مابین چند معنوی قرائن تسلیم کئے جا چکے ہیں۔ الفاظ کے ان معنوی قرینوں کو جنھیں کلاسیکی کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ جتنی خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کیا جائے گا، شعر کا درجہ اتنا ہی بلند ہو جائے گا۔ شعر کے اندر کچا پن اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر الفاظ، تشبیہات اور استعارات کے کلاسیکی استعمال سے ناواقف ہو۔ فیض ان پابندیوں کی پرواہ نہیں کرتے لیکن احمد ندیم کسی قدر کرتے ہیں، ان کے دوست ساحر لدھیانوی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پایۂ سخن اس اعتبار سے، محترم فیض کے مقابل بلند تر ہے۔ اب رہے سیّد عبدالحمید عدمؔ۔ انکی غزلوں کا مزاج اور کردار ہی سب سے الگ ہے۔ یہ بے شک ایک انفرادیت کی بات ہے، مگر عدمؔ کی غزلیں اردو تغزّل کی ہمہ گیری سے تہی دامن ہیں۔ پینا پلانا، چھیڑنا گدگدانا اور مچلنا بہکنا انھیں مرغوب ہے، اور بہتر ہے کہ ہم اس مست ہشیار سے اس عالم میں تعرض نہ کریں ——— اس موقع پر فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمی اور سیّد عبدالحمید عدمؔ کا تذکرہ کسی خاص وجہ سے نہیں کیا گیا یعنی اس لئے نہیں کیا گیا کہ بشیر فاروق اور ان حضرات کے درمیان کوئی باقاعدہ مجلس مناظرہ منعقد کرائی جائے۔ یہ حرکت نامناسب بھی ہے اور غیر مفید بھی۔ غرض کرنا صرف یہ تھا کہ آج کل اُردو غزل کے چند نمائندے کیا کر رہے ہیں اور بشیر فاروق کس منزل میں ہیں۔ یہ بات کہی جا چکی ہے کہ زیرِ نظر مجموعۂ کلام اُن کی یکسالہ کاوشِ فکر کا نچوڑ ہے۔ آج سے دس سال قبل وہ باقاعدہ شاعر تھے، یعنی، زلف و رخ کی تعریف میں خاصے سلیقے کے شعر نکال لیا کرتے تھے اور خود بھی

گاہے گاہے مشاعروں میں جا نکلتے تھے، لیکن ۱۹۴۷ء کے بعض حالات کے سبب اُن کا شاعرانہ وجود گہنا گیا۔ ایک سال ہوا کہ وہ گہن سے چھوٹے اور انھوں نے چمکنا شروع کیا اور اُن کی فنی چمک برابر بڑھتی جا رہی ہے۔

یہاں سے ابتدا کی جائے کہ ان کا رنگِ کلام کیا ہے، مگر "رنگِ کلام" سے کیا مُراد؟ فی الحال رنگِ کلام سے مُراد یہ ہے کہ اُن کے شعر کی ہیئت اور اس کے خدوخال کا تعین کیا جائے، بیشک شعر کی ظاہری ہیئت بھی اس سلسلہ میں فیصلہ کن اہمیت رکھتی ہے۔ مضامین کے لحاظ سے سعدی اور ہمام دونوں کی شاعری کے درمیان کوئی زمین آسمان جیسا فرق نہیں پایا جاتا، بہت سے مضامین جو سعدی کی غزلیات میں ملتے ہیں وہ ہمام کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ تو پھر کیا چیز ہے جس نے سعدی کو سعدی بنا دیا اور ہمام صرف اس لئے تاریخِ ادب میں زندہ رہا کہ وہ سعدی کا ہم عصر یا حریف تھا۔ وہ عجیب وصف جس نے سعدی کو سعدی بنایا، اظہارِ خیال کا وہ نادر اسلوب ہے جو سعدی سے مخصوص ہے۔ ایک فطری توفیق اور مناسبت ہوتی ہے جو کسی شاعر کو الفاظ کا صحیح فنکارانہ استعمال سکھلاتی ہے، بلکہ ایک الہام ہوتا ہے، یُوں کہنے کو ہر لفظ معمولی ہے کسی لفظ میں بجائے خود کوئی خوبی اور کوئی نقص نہیں لیکن لفظ جب شاعر کے وجدانی تجربے کی بھٹی میں تپ کر نکلتا ہے تو اس میں موتی جیسی آب و تاب، انگارے جیسی دمک اور ہیرے جیسی کاٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ بشیر فاروق کے کلام پر نظر ڈالنے کے بعد پہلی مرتبہ ان کے کہنے کا ڈھنگ آپ کو اپنی طرف متوجہ کر لے گا۔

پہلے آپ ان کے دس' پندرہ شعر سن لیجئے اور ان کے کہنے کے ڈھنگ کا اندازہ لگائیے۔

گذر رہی ہے مری زیست تلخ تر ساقی
شرابِ تند سے جامِ نشاط بھر ساقی
ہزار بار افق سے گذر گیا خورشید
ہوئی نہ شب مری آسودۂ سحر ساقی

* * *

ہم ہی طوفاں سے آشنا نہ ہوئے
موج ٹکرا گئی سفینوں سے

* * *

دعائیں صبحِ بہاراں کی مانگنے والو
نہ راس آئیں بہاریں اگر تو کیا ہو گا
دلیلِ صبح سہی، ڈوبتے ہوئے تارے
ہوئی نہ پھر بھی نمودِ سحر تو کیا ہو گا

* * *

کھلیں کس طرح اب آخر غمِ روز و شب کے عقدے
نہ وہ آہِ صبح گاہی، نہ وہ نالۂ شبانہ

* * *

بغیرِ سوزِ دروں ہے تمام کم نظری
فغانِ نیم شبی ہو کہ نالۂ سحری

* * *

مجھے خلوص نے لوٹا تو کچھ مروّت نے
اداشناسِ جنوں کی نہ پوچھ حیلہ گری

* * *

تخلیقِ کائنات اگر کر سکے تو، کر
پیدا خود اپنے شام و سحر کر سکے تو کر

تارے مراحلِ سفرِ شوق ہی سہی
تاروں کو بھی شریکِ سفر کر سکے تو کر
فاروق! یہ بہارِ چمن پھر نہ آئے گی
یارانِ میکدہ کو خبر کر سکے تو کر

* * *

رقص میں آگیا ہے عالمِ حسن
مطربِ شوق نے اُٹھایا ساز
جس پہ نازاں ہے زخمہ زن فاروق
ہم اسی ساز کی ہیں اک آواز

* * *

تری محفل سے پہلے بھی پریشانی مقدر تھی
تری محفل میں آکر بھی پریشانی نہیں جاتی
نجانے زندگی نے کتنے میخانے لنڈھا ڈالے!
مگر اہلِ طلب کی تشنہ سامانی نہیں جاتی

* * *

طلب ہے ہم اُن کی، بہاری وہ جستجو کرتے
تمام عمر گذاری، یہ آرزو کرتے
اگر مآلِ بہاراں سے باخبر ہوتے
تو ہم کبھی نہ تمنائے رنگ و بُو کرتے

* * *

محفوظ بجلیوں سے گلستاں ابھی نہیں
ہاں اہتمامِ جشنِ بہاراں ابھی نہیں
میرا نصیب ہیں غمِ دوراں کی تلخیاں
میرے نصیب میں غمِ جاناں ابھی نہیں

* * *

موت ہے کشمکشِ موج و تلاطم سے گریز
زندگی کیا ہے حریفِ یم و طوفاں ہونا
اپنی ہی انجمنِ شوق میں ہو نغمہ سرا
ننگ ہے غیر کی محفل میں غزلخواں ہونا

اُن سے اتنا نہ ہوا پرسشِ غم ہی کرتے ہم سے دیکھا نہ گیا جن کا پریشاں ہونا

***

اسے حسن کہنا بجا نہیں نہ جو حسن آئینہ ساز ہو اے عشق کہنا روا نہیں جو ہو دور اپنے مقام سے
مرے پاس اپنا پیام ہے، مرے پاس اپنا نظام ہے مجھے کیا کسی کے پیام سے، مجھے کیا کسی کے نظام سے

***

قبائے گل و غنچہ کو سینے والے کئی چاک دامن یہاں اور بھی ہیں
ابھی اور بھی بجلیاں ہیں فلک پر زمیں پر ابھی آشیاں اور بھی ہیں
نہیں شمع و پروانہ پر منحصر کچھ تری بزم میں بے زباں اور بھی ہیں

***

مہ و انجم فروزاں ہیں ابھی کچھ رات باقی ہے الٰہی کیوں فسردہ شمعِ محفل ہوتی جاتی ہے

***

نگاہِ شوق ہی کیا ہے جو دلبرانہ نہیں ادائے شوق ہی کیا ہے جو کافرانہ نہیں
مری حیات رہی ہے اسیرِ گیسوئے غم کسی کی زلف سے الجھا کبھی زمانہ نہیں
شرابِ نو میں یہ مانا کہ مستیاں ہیں بہت مگر وہ کیف و سرورِ مئے شبانہ نہیں

***

صبا آوارہ، گل افسردہ، برگ و بار پژمردہ یہ عالم تھا مرے گلشن میں جب صبحِ بہار آئی
نگاہِ شوق نے ڈھونڈا تجھے ہر لالہ و گل میں زبانِ آرزو صحنِ گلستاں میں پکار آئی

چمن والے مرے رنگِ طلب کو پا نہیں سکتے
وہ کہتے ہیں خزاں آئی، میں کہتا ہوں بہار آئی

جفا کیشی تری عادت، وفا کیشی مری فطرت
وہ تجھ کو سازگار آئی، یہ مجھ کو سازگار آئی

——— ٭٭٭ ———

دن کہاں گذرا ہے تیرا مرے خورشید جمال
رات تیری مرے مہتاب کہاں گذری ہے

جس سے اسرارِ چمن فاش ہوئے جاتے تھے
طبعِ صیّاد پہ وہ بات گراں گذری ہے

پھر اسیروں پہ کوئی تازہ ستم ٹوٹا ہے
آج پھر بادِ سحر نوحہ کناں گذری ہے

تجھ کو معلوم ہے اے جانِ وفا، تیرے بغیر
زندگی کتنی سبک، کتنی گراں گذری ہے

——— ٭٭٭ ———

سراغ اس کا حرم دے سکا نہ بُت خانے
تڑپ رہی ہیں جبینیں جس آستاں کیلئے

ہزار بار لٹے ہیں رہِ محبّت میں
ہزار بار مٹے ہیں غمِ جہاں کے لئے

——— ٭٭٭ ———

مَیں نے وعدہ کیا تھا کہ بشیر فاروق کا "رنگِ کلام" پیش کرنے کے لئے میں ان کے پندرہ بیس اشعار نقل کروں گا لیکن اس مقصد سے جب ان کی "بیاضِ غزل" کھولی تو بیس پچیس غزلیات ہی سے پورے چالیس شعروں کا انتخاب کر لینا پڑا اور یہ بھی بہت ہاتھ روک کر ورنہ انھیں غزلوں میں اور بھی کام کے شعر تھے۔ ان شعروں سے کیا اندازہ ہوتا ہے؟ یہ کہ اس مجموعہ کے مصنّف کی غزل خوانی اور سخن رانی کا مزاج "خاص" ہے۔ اور اسی مزاج کے پیشِ نظر وہ الفاظ کا انتخاب کرتا ہے، غزل کے عام الفاظ کا انتخاب، لُغات کا نہیں،

میں نے عرض کیا تھا کہ الفاظ کے بجائے خود کوئی معنی نہیں ہوا کرتے، لکھنے والے یا بولنے والے کا مزاج الفاظ کے معنی مقرر کیا کرتا ہے، غزل کی حد تک کسی لفظ کے معنی یونہی نہیں بن جاتے۔ شاعر کے ذہن میں کسی داخلی یا خارجی محرک کے سبب تخلیق کی آگ بھڑکتی ہے۔ اُس کے ذہن میں ایک بے پناہ زلزلہ نمودار ہوتا ہے، کرب کی اس شدید کیفیت میں ایک خیال یا چند مضامین اُس کی روح میں جنم لیتے ہیں، اور وہی چند مضامین یا ایک خیال اپنے اظہار کے لئے الفاظ چنتا ہے۔ الفاظ بے جان پتلیوں کی طرح اُس کے سامنے پڑے ہوتے ہیں وہ اِن پتلیوں میں نئے معنی کی روح پھونکتا ہے اور ہر لفظ بالکل نئے معنی اختیار کر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میر تقی میر، مرزا غالب، مرزا داغ اور اقبال کو لے لیجئے، چاروں نے غزلیں لکھی ہیں لیکن چاروں نے اپنی غزلیات میں الفاظ کا استعمال اپنے فن کارانہ شعور اور تخلیقی صلاحیتوں کے تحت کیا ہے، اِس طرح ہر بڑے شاعر کے یہاں ہر لفظ کے معنی وہ ہوتے ہیں جو وہ متعین کرتا ہے نہ وہ کہ جو ڈکشنری میں لکھے ہوئے ہیں یا عام لوگ سمجھتے ہیں۔

بشیر فاروق کے اِن شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزل سطحی معاملہ بندی، رسمی عشق اور مریضانہ جنسی جذبات سے بلند ہوتی ہے، بازاری عشق اُن کے اپنے مزاج سے کوئی مناسبت بھی نہیں رکھتا، عشق جب شخصی تعینات سے اوپر اُٹھتا ہے تو اس میں ایک خاص قسم کی روحانی پاکیزگی، انسان دوستی اور اجتماعی درد کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ بشیر فاروق کے شخصی تعینات اور انفرادی تجربات مسّی "شہناز لالہ رُخ" کی سطح سے بلند ہو گئے ہیں۔ وہ عشق اب بھی کرتے ہیں۔ کس سے؟ بلند تر اخلاقی مقاصد سے۔ حُسن اب بھی

ان کی نگاہ میں اتنا ہی محبوب ہے۔ کس کا؟ کائنات کا، اِنسانیت کا، روحانیت کا، الغرض، تغزل میں شعور و تفکر کا، یہ مقام کلاسیکی اہمیت کا حامل ہے اور اس قسم کے متغزلانہ شعور و فکر کے لئے خاص قسم کا پیرایۂ بیان یعنی کہنے کا ڈھنگ مطلوب ہے، یہاں الفاظ (یعنی غزل کے عام الفاظ مثلاً ہجر، وصال، سوز، درد، برق، آشیاں، طوفان، تلاطم، کنارہ، ماہ و انجم اور حسن و عشق) کے خاص معنیٰ ہوتے ہیں۔ نئے طرز کی بندشیں اور ترکیبیں اور نئے ڈھنگ کے استعارے اور کنائے ان مضامین کے لئے تلاش کرنا پڑتے ہیں اور اس طرح بغیر کسی قصد و ارادہ کے غزل کی وہ زبان وجود میں آجاتی ہے جس سے عام روایتی غزلیں تہی دامن ہوا کرتی ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ غالبؔ، اقبالؔ اور اصغرؔ گونڈوی کی غزلیات کا طبقہ دوسروں سے مختلف ہے، وہی مقامِ شعور و فکر — میرا دعویٰ ہرگز نہیں کہ بشیر فاروقؔ "غالب و اقبالؔ" کے مقامِ شعور و فکر پر فائز ہیں، بے شک اس قسم کا تصور بھی گستاخی ہوگی، کہنا صرف یہ ہے کہ اُن کے اپنے سوچنے کا ڈھنگ، عام شاعروں سے قدرے مختلف ہے، وہ اقبالؔ و غالبؔ کے مقلد نہیں، لیکن طبعاً سوچتے اُسی ڈھنگ سے ہیں اور لامحالہ اُن کے کلام سے کہیں کہیں وہ رنگ ٹپکنے لگتا ہے، اور ایسا ہونا ناگزیر تھا، بعض اوقات تو بڑے شعراء کی لفظی اور معنوی تقلید صرف روائتی اور رسمی طور پر کی جاتی ہے، کتنے حضرات ایسے ہیں جو اپنی غزلوں میں مرزا غالبؔ کی مخصوص بندشیں استعمال کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ احساسِ کمتری کی دلیل ہے۔ اور کوئی تخلیقی ذہانت احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہو سکتی، لیکن کبھی کبھی (اور یہ کبھی کبھی بڑی غنیمت ہوتی ہے) یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر اپنے گہرے اور مخلصانہ وجدانی

تجربوں کے بعد انھیں حقیقتوں کو چھو لیتا ہے۔ (یا چھونے کی کوشش کرتا ہے) جنھیں کوئی عبدالقادر بیدل، کوئی میر تقی، کوئی درد، کوئی سودا، کوئی آتش، کوئی شاہ نصیر، کوئی غالب کوئی مومن، کوئی داغ، کوئی حالی، کوئی حسرت موہانی، کوئی اقبال، کوئی اصغر اور کوئی فانی بدایونی اس سے قبل دریافت کر چکا ہے تو پھر وہی پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے۔ ان حقیقتوں کے اظہار کے لئے مناسب حال ہو کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہر مضمون کے اظہار کے لئے الفاظ بھی مخصوص ہوا کرتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ ترچھی نظر، انگیا، چوٹی، موباف، دوپٹہ، بوسہ ولب، مسہری، پھولوں کی سیج، راگ، پٹہ، سارنگی، ٹھمری، جھانجن اور پازیب کے ساتھ زندگی اور محبت کے متعلق کوئی مخلصانہ، سنجیدہ اور زندہ بات کہی جا سکے۔ غزل میں معاملہ بندی اور رومانی واقعہ نگاری کے خاص خاص مقامات ہیں۔ جہاں یہ الفاظ پھول کی طرح کھل جاتے ہیں، لیکن بعض اعلیٰ خیالات اور سنجیدہ حقائق کے اظہار کے لئے کون ان الفاظ کو استعمال کرے گا اور کیوں؟

بشیر فاروق شاعر تو ضرور ہیں۔ نہ ہوتے تو اُن کا مجموعۂ کلام ہی کیوں شائع ہوتا۔ لیکن ان کی شاعری واضح طور پر چند قیود و شرائط رکھتی ہے۔ یہ فن انکے لئے ذریعۂ معاش تو خیر تھا ہی نہیں، نہ ہی شہرت کیونکہ جو شخص قدرتِ شعر گوئی کے باوجود ۴۷ء سے ۵۵ء تک زبان سیئے بیٹھا رہا۔ اور ہر رسالے میں چھپنے کی مقدرت کے باوجود چھپے رہنے پر مصر ہوا۔ اس کو شہرت طلبی سے علاقہ ہی کیا ہو سکتا ہے، پھر بشیر فاروق کی شعر گوئی کے محرکات کیا ہیں؟

اُن کے ذہن کی خاص بناوٹ ہے، اُن کی سوچ کا خاص ڈھنگ ہے، اور اُن کے احساس و تفکر کا مخصوص انداز ہے جو ان کے کلام کے حرف حرف سے ٹپکتا ہے۔ بشیر فاروق کی نظر آفاقی اور تصورِ شعر اجتماعی ہے، وہ اس بے پناہ نظریاتی اور سماجی کشمکش سے روحانی طور پر سخت متاثر ہیں جو اس عہد کی زندگی کے ہر گوشے میں تیزی اور تندی کے ساتھ جاری ہے، انھیں اپنی قوم اور اپنے وطن سے محبت ہے، یہ محبت اُن کی رُوح میں بسی ہوئی ہے اور صحیح معنی میں ایک حساس انسان ہے بھی وہی جو اپنے لوگوں، اپنے تہذیبی ورثے، اپنی تاریخی خصوصیات، اپنے معاشرے کی صحت مند اقدار اور اپنے معنوی وجود سے اس عقیدت کے ساتھ محبت کرتا ہو، گویا اپنی قوم و وطن کی محبت کے ساتھ وہ پورے عالمِ انسانی کے ساتھ حقِ محبت ادا کر رہا ہے۔ شاعر کو عام انسانوں کی بدحالی اور اس اخلاقی تنزل و انحطاط کا بڑی شدّت سے احساس ہے جو دُنیا بھر میں ہر ذہین آرٹسٹ کو خواہ وہ فلسفی ہو یا شاعر، بے چین کیے ہوئے ہے، یہ گہرا روحانی احساس اُن کے ذہن کو دائمی کرب میں مبتلا رکھتا ہے اور اُن کی شاعری نے اسی دائمی کرب سے جنم لیا ہے، قیمتی ہیرا وہی ہے جو سنگلاخ چٹانوں کے شکم سے برآمد ہو اور زندہ شاعری وہی ہے جو کسی اعلیٰ روحانی کرب کی تخلیق ہو۔ میں نے بشیر فاروق کی شاعری میں انکے "ذہن" کو پڑھا ہے۔

اُن کا ذہن یعنی اُن کا شاعرانہ مزاج، روایتی عشق کی لطافت و کثافت سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتا، وہ خود کہتے ہیں کہ

اُٹھائیں ناز حسینوں کے کس لئے فاروقؔ
مزاج ازل ہی سے "عاشقانہ" نہیں

عارض و گیسو کے متعلق اُن کا رویّہ ہے کہ

اپنی قسمت نہ ہوئے عارض و گیسو فاروقؔ
محفلِ ناز میں گو عمرِ رواں گذری ہے

بھلا جو شاعر حسینوں کے ناز اٹھانے پر تیار نہ ہو، جو اپنے مزاج کو عاشقانہ نہ کہلوانے پر اصرار کرے، جو "محفلِ ناز" میں عمرِ رواں گذارنے کے باوجود عارض و گیسو کو اپنی قسمت نہ بنا سکے اس سے آپ یہ توقع ہی کیوں رکھتے ہیں کہ وہ رسمی انداز کی غزلیں لکھے اور انھیں گا گا کر مشاعرے میں سنائے گا۔ ہاں انھیں عشق[1] ہے۔ اُن کے طبیعت کا فولاد عشق کے تابناک جوہروں سے خالی نہیں، لیکن ان کا عشق بلند تر نوعیت رکھتا ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے انھیں نوعِ انسانی سے عشق ہے، وہ مظلوم انسانیت سے محبت کرتے ہیں۔ انھیں اپنی قوم سے پیار ہے۔

بشیر فاروقؔ دُنیا کے ہر ذہین شاعر اور ہر حقیقت پسند فن کار کی طرح محسوس

---

[1] بشیر فاروقؔ کی نظر میں عشق کی حقیقت کیا ہے؟

عشق خوددار بھی ہے صاحبِ ادراک بھی ہے
روحِ تخلیق بھی ہے محرمِ لولاک بھی ہے
بارہا رزم گہِ زیست میں دیکھا فاروقؔ
شاخِ نمناک بھی ہے شعلۂ بیباک بھی ہے

یا

عشق میں سوز بھی ہے، ساز بھی ہے، درد بھی ہے
حُسن خود بینیٔ جلوہ کے سوا کچھ بھی نہیں

کرتے ہیں کہ آج بے انتہا سائنسی اور مادّی ترقیوں کے باوجود انسانی تہذیب مسلسل طور پر زوال پذیر ہے، آج دُنیا میں ایک طرف تو بڑی فراوانی کے ساتھ سامانِ عشرت پیدا کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف انتہائی بیرحمی کے ساتھ انسانوں کی اکثریت کو دائمی فاقہ کشی کے عذاب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے انسانی رُوح کے لافانی جوہر دل یعنی صداقت، اِخلاص، روحانیت، بہتر زندگی بسر کرنے کی تمنّا، سماجی مساوات اور خصوصیت سے مخلصانہ عشق وغیرہ کو دیدہ و دانستہ کچل ڈالا گیا ہے۔ مشین کی ترقی کے ساتھ انسان بھی روز بروز "میکانیکی" بنتا چلا جا رہا ہے۔ نہیں، بلکہ مشینوں نے اُسے مستقل طور پر اپنا غلام بنا لیا ہے۔ یہ دُنیا ہو یا وہ دُنیا، اب انسان کو کسی چیز پر عقیدہ باقی نہیں رہا۔ ہم سب کی روحیں بے یقینی کے اندھیرے میں بھٹک رہی ہیں۔ زندگی کے تمام اعلیٰ تصورات یا ختم ہو چکے ہیں یا نزع کے عالم میں مبتلا ہیں۔ اِن حالات میں ایک ذہین شاعر کا وجدانی اور روحانی ردِّ عمل کیا ہونا چاہیے؟

وہی جو بشیر فاروق کا ردِّ عمل ہے۔

بشیر فاروق اِس دُنیا کو موجودہ حالات میں ناقابلِ برداشت تصوّر کرتا ہے۔ وہ نئی زندگی، نئے عشق اور نئے حُسن کا تمنّائی ہے، اور ایک ایسے "عہدِ جدید" کا منتظر، جہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کی تمنّا نہ صرف تمام حقیقی فنکاروں بلکہ تمام شریف اور مخلص انسانوں کی زندگی کو قابلِ برداشت بنائے ہوئے ہے۔ اگر یہ تمنّا بھی چھین لی جائے تو سچ مچ جینا "اجیرن" ہو جائے۔ بشیر فاروق کی شاعری اسی تمنّا کی طرف

قدم بقدم سفر طے کر رہی ہے۔ لیکن ہمیں اس مقام پر تھوڑی دیر ٹھہرنا پڑے گا۔ آج کے تمام حقیقت پسند شاعر اور فن کار "نئی دُنیا" کی جستجو میں سرگرم ہیں۔ وہ نئی دُنیا کون سی ہے! مارکسی (کمیونسٹ یا اِصطلاحی ترقی پسند) اَدیب شاعر کہتے ہیں کہ وہ نئی دُنیا "سوشلسٹ سَماج" کے بَطن سے پیدا ہوگی، لہٰذا ہمیں اپنے ذہن، اپنے دماغ اور اپنے قلم کی تمام تر توانائیاں اسی مقصد کے لئے صرف کر دینی چاہئیں کہ ایک سوشلسٹ سَماج کے قیام کے لئے زبردست اَور ہمہ گیر رائے عامہ وجود میں آجائے، ہمارے شعروں، ہمارے گیتوں، ہمارے فن پاروں اور ہمارے تخلیقی شاہکاروں کی روح اور اُن کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ عام انسان کمیونسٹ اِنقلاب برپا کرنے کے لئے محرّک اَور سرگرمِ عمل ہو جائیں، کاش "کمیونسٹ مُعاشرہ" یا "سوشلسٹ سَماج" اور اِس سوشلسٹ سَماج کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نظریاتی اور روحَانی زندگی قابلِ حصول ہوتی، مگر یہی نہیں کہ وہ صرف ناقابلِ حصول ہو بلکہ اس کا حصول ناقابلِ برداشت بھی نہیں، روس میں کمیونسٹ مُعاشرے کے قیام کو تقریباً نصف صدی گذر چکی ہے لیکن کیا روس کے اندر وہ "جنّتِ تصوّر" اور "فردوسِ تمنّا" وجود میں آگئی، جس کے لئے (اِصطلاحی) ترقی پسند ادب چالیس بَرس سے متحرّک، مصروف اور سرگرم رَہا ہے، اَب رَہا امریکی طرز کا جمہوری مُعاشرہ، تو وہ محض فریب ہے جو مغربی جمہوریتیں خود کو اَور دوسروں کو برسوں سے دے رَہی ہیں، دَرحقیقت وہ اَب تک مستعمراتی ذہنیت کے تحت عمل کر رہی ہیں۔ مَیں اس موقع پر اس بحث میں نہ پڑوں گا کہ

مارکسی ادب، مارکسی آرٹ اور مارکسی نظریۂ جمالیات کے روز افزوں انحطاط کا سبب کیا ہے، میں تو صرف اس امرِ واقعہ کا اظہار کروں گا کہ لبقول (اصطلاحی) ترقی پسندوں کے ــــــــ "ادب جمود سے دوچار ہو گیا ہے۔"

چلئے بات ختم ہو گئی، ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیب "جمود" سے دوچار ہو چکے ہیں تو پھر ہم کن لوگوں سے توقع کریں کہ وہ اپنی تخلیقی ذہانت کو بروئے کار لاکر ہمیں نئی روحانی زندگی بخشیں گے ؟

یہاں پھر بشیر فاروق ہمارے سامنے آتے ہیں، صرف بشیر فاروق ہی نہیں بلکہ وہ تمام شعراء جو اس نام نہاد "جمود" سے دوچار نہیں ہوئے۔

گفتگو تھی بشیر فاروق کے مزاجِ سخن کے متعلق۔ ان کے مزاجِ سخن کی گیرائیوں کو پانے اور گہرائیوں کو چھونے کے اس نظریاتی اور تہذیبی کشمکش کو پیشِ نظر رکھنا پڑے گا جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل قیامِ پاکستان کا روحانی اور مادی محرک اور قیامِ پاکستان کے بعد ہماری اجتماعی زندگی کا ایک مستقل کردار (فیچر) بن گئی ہے۔ سب سے پہلے شاعر کی روح کو جھانکنا چاہئے کہ اُس کے شعروں کو سمجھا جا سکے۔ بشیر فاروق کی شاعرانہ روح کو سمجھنے کے لئے حسبِ ذیل شعروں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

وہ عشق کیا جو ہو نا آشنائے جذبِ جنوں　　　وہ زخم کیا جو ہو احسان مندِ چارہ گری

یہ مجھ کو کون سی منزل پہ عشق لے آیا　　　نہ کام آئی دلِ نکتہ داں کی نکتہ وری

ــــــ ***ــــــ

ہر نوا عشق کی خلش افروز ہر ادا حُسن کی بہانہ ساز
حُسن کی انجمن نشاط و سُرور عشق کی کائنات سوز و گداز

——— *** ———

زباں سے مہر و محبّت پکارنے والو دلوں میں مہر و محبّت نہیں تو کچھ بھی نہیں

——— *** ———

جو کر سکے نہ رفو اپنا پیرہن فاروق کسی کا چاکِ گریباں وہ کیا رفو کرتے
بہت دنوں سے ہے تیغِ زمانہ تشنۂ خوں کہاں ہیں اہلِ جنوں پیش جو گلو کرتے

——— *** ———

ذرّوں کو حریفِ مہ و خورشید بنا دو انساں کی راہوں میں ستاروں کو بچھا دو

——— *** ———

عقل کہتی ہے فقط ساحل سے طوفانوں کو دیکھ عشق کہتا ہے کبھی منّت کشِ ساحل نہ ہو

——— *** ———

عشق ہے بندۂ آزاد کا مقصودِ حیات عقلِ بُت گر نے تراشے ہیں ہزاروں معبود
وسعتیں اور عطا عرصۂ آفاق کو کر تنگ ہے میرے جنوں پر یہ جہانِ محدود

اِن چند اشعار سے اندازہ ہو سکے گا کہ حسن عشق اور حیات کے متعلق ان کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ "نقطۂ نظر" کی ترکیب صرف دو لفظوں پر مشتمل ہے، لیکن کتنی اہم، کتنی روح فرسا اور کتنی دِقّت طلب چیز ہے۔ شاعر کے "نقطۂ نظر" کو سمجھنے کی ترکیب۔ اب ذرا یہ اور

دیکھ لیں کہ موجودہ حیاتِ اجتماعی یا سماجی زندگی اور اُس کی تہ در تہ الجھنوں کے متعلق اُنھوں نے یعنی بشیر فاروق نے کیا کہا، یہاں "سماجی زندگی" سے اس عہد کی زندگی مراد ہے جب پورا معاشرہ، سارا سماجی ڈھانچہ دو طبقوں میں بٹ گیا ہے۔ آجر و اجیر یعنی لوٹنے والوں اور لوٹے جانے والوں کا طبقہ، اب ذرا بشیر فاروق کی زبان سے یہ کہانی سن لیجیے۔ اُنھوں نے پوری داستان ایک غزل یا نظم میں بیان کر دی ہے اور خاصے جوشِ بیان اور زورِ کلام کے ساتھ۔

آزاد کی دُنیا میں ترنم ہی ترنم ، مزدور کی دُنیا میں تلاطم ہی تلاطم
زردار کی راتوں میں ضیا بارئ انجم ، نادار کی راتوں میں اندھیرا ہی اندھیرا
اک وہ ہیں کہ آفاق میں محرومِ تکلم ، اک وہ ہیں کہ تقدیر میں نغمات ہی نغمات
رقصاں ہے کسی لب پہ طربناک تبسم ، لرزاں ہیں کسی آنکھ میں نمناک ستارے
صہبائے مسرت کے لنڈھاتا ہے کوئی خم ، پیتا ہے شب و روز کوئی خونِ تمنا

مٹ جائے گی یہ حاکم و محکوم کی تفریق
جس دن بھی ہوا بندہ و آقا میں تصادم

میرا خیال ہے کہ میں نے "بشیر فاروق" کو مع اُن کے ذہن و فکر اور روح کے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ اس بارے میں لکھنا تھا، قلتِ فرصت اور "فقدانِ سکون" کے سبب نہ لکھ سکا، میں اس سلسلے میں محتاط اس لئے بھی ہوں کہ بد قسمتی یا خوش قسمتی سے، میں نے اُن کے کلام پر "اصلاحی نظر" بھی ڈالی ہے، اور جب کوئی شخص

پہلے ہی سے کسی چیز کا خریدار یا طلبگار ہو جاتا ہے تو اُس کی رائے منصفانہ اور عادلانہ نہیں رہ سکتی۔

رخصت چاہنے سے قبل یہ اور عرض کر دوں کہ میں نے اس "پیش لفظ" کو مختلف نشستوں میں لکھا ہے اور بغیر کسی فنی اور بیانیہ منصوبہ بندی کے اپنے خیالات پیش کر دیئے ہیں۔ بہر حال ختم کلام سے قبل بشیر فاروق کے چند شعر اور سُن لیجئے اور پھر محفل برخواست۔

باقی داستانِ فردائے شب را ؎

بہار یہ ہے اسی کو بہار کہتے ہیں — نہ ذکرِ غنچہ و گل ہے نہ فکرِ بادۂ و جام
یہ کیسی منزلِ شب ہے یہ کیسا عالمِ صبح — بجھی بجھی سی سحر ہے، اداس اداس سی شام

— * * * —

ہر ایک ناخدا نے سفینوں پہ خیر سے — احسان وہ کئے ہیں کہ طوفاں نہ کر سکے
اس واسطے ہر اک کو نیا غم دیا گیا — کوئی کسی کے درد کا درماں نہ کر سکے
اپنے بھی داغِ دل مہ و انجم سے کم نہ تھے — یہ اور بات ہے کہ چراغاں نہ کر سکے

— * * * —

در پردہ تھے وہ زخمِ تکلم لئے ہوئے — جو پھول زیرِ لب تھے تبسم لئے ہوئے
لائے نہ اپنے لب پہ شکایت کا ایک حرف — گو دل میں تھے ہزار تلاطم لئے ہوئے

— * * * —

یہ کیسی صبحِ درخشاں وطن میں آئی ہے — ترس گئے ہیں سویرے کرن کرن کیلئے

یہ کیسا دن ہے کہ خورشید کو ترستے ہیں — یہ کیسی محفلِ شب ہے کہ بجھ رہے ہیں چراغ
کہیں وہ مطربِ ہستی نظر نہیں آتا — نوا سے جس کی ملے عظمتِ کہن کا سراغ

ابھی ہے برق کی زد میں بہارِ لالہ و گل
ہنوز دقفِ خزاں ہے سحر کی رعنائی

اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں۔

رئیس امروہوی

۲۶ر اکتوبر ۱۹۵۸ء

تعارف

کوئی بیس بائیس برس پہلے کوئٹہ میں بشیر فاروق سے میری ملاقات ہوئی۔ اُنہی دِنوں ایک مقامی اَخبار میں مجھے اُن کا منظوم کلام دیکھنے کا موقع مِلا۔ کوئٹہ ایسی دُور اُفتادہ جگہ میں اُردو زبان میں شعر کہنے والوں اور شعر سمجھنے والوں کی تعداد نہایت کم اور ایک حد تک علّامہ عیش فیروز پوری کے شاگردوں اور ملک محمّد صادق شاذؔ کے حلقۂ احباب تک محدود تھی (راقم کو اِن دونوں حلقوں سے مِلنے کا شرف حاصِل رہا ہے) اس کے بعد گاہ بگاہ مجھے فاروقؔ کا کلام کوئٹہ کی اَدبی محافل میں سُننے کا موقع مِلتا رہا۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اِجلاس میں قرارداد پاکستان منظور کی اور برِصغیر کے طول و عرض میں سیاسی کشمکش کی لہر دوڑ گئی۔

کوئٹہ کا مخلص، حسّاس اور نوجوان شاعر فاروقؔ حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں صفِ اوّل میں تھا، اور ۱۹۴۰ء ہی سے فاروقؔ کا کلام سرتاسر مسلمانانِ ہند کے مستقبل سے وابستہ ہوگیا، چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

درد ملّت ہے جو مجھ سے کہلوا لیتا ہے شعر
مایۂ نازش نہیں ہے شاعری میرے لئے

آج یعنی ۱۷۔۱۸ سال بعد اِس کلام پر تنقیدی نظر ڈالنا تو مناسب نہ ہوگا، لیکن

اِتنا ضرور کہوں گا کہ پڑھنے اور سننے والوں پر اُن دنوں اس کا گہرا اثر تھا، اور اِس اثر کی وجہ فاروق کے کلام کی فصاحت و بلاغت یقیناً نہ تھی، یہ اس کی طبعی حرارت و جوش اور گہرے خلوص کا اثر تھا، الفاظ اور طرزِ بیان کتابوں سے سیکھا جا سکتا ہے مگر سوز و گداز صرف ایک حساس دل کا سرمایہ ہے۔ ؎

وہ دل کہ درد کی لذّت نہ مِل سکی جس کو
کہاں سے لائے متاعِ اثر فغاں کے لئے

ایک مُدّت کے بعد مجھے دوبارہ اپنے دیرینہ دوست اور ادبی ہمکار سے کراچی میں مصاحبت کا موقع مِلا، میں نے دیکھا کہ اپنے کاروبار میں اُنھیں غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی ہے اور تجارتی اور کاروباری حلقوں میں کئی رسمی اور غیر رسمی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باوجود اپنی گوناگوں کاروباری مصروفیات کے فاروق صاحب اب بھی کبھی کبھی شعر کہتے ہیں اور شعراء اور ادباء کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔

اُن کے کلام کے مختلف نمونے پڑھنے اور ریڈیو مشاعروں سے سننے کا اتفاق ہوا۔ تو میں نے محسوس کیا، جہاں اُن کے خیالات اور تصورات وسیع تر دائرے میں حرکت کر رہے ہیں شعر کی زبان اور طرزِ بیان پر اُنھیں پہلے سے بہت بہتر تسلّط حاصل ہے۔ میں نے اُن کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ اپنے کلام کا ایک مختصر مجموعہ شائع کریں تاکہ شعر دوست لوگوں کو ایک محض تصوراتی نہیں بلکہ ایک حقیقی شاعر سے آشنائی کا موقع مِل سکے۔ مجھے

نہایت خوشی ہے کہ اُنھوں نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ مرتّب کرلیا ہے اور اُسے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جہاں تک فنِ شاعری کا تعلق ہے اس کے متعلق بعض دیگر اہلِ علم وادب نے قلم فرسائی فرمائی ہے اور خاکسار اس پر کسی قسم کا اضافہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ لیکن فنِ شاعری کی نسبت روحِ شاعر سے مجھے ایک مدّت سے تماس رہا ہے، اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شاعر کے کلام میں مجھے ایک پُر درد اور حسّاس دل کا ارتعاش نظر آتا ہے اور یہ کسی قوم کی ادبی زندگی کا ہمیشہ قائم رہنے والا سرمایہ ہے۔ آخر میں اُن کے چند شعر درج کرنا مناسب ہوگا۔

جنوں نوازِ طبیعت نہیں تو کچھ بھی نہیں
فسوں طرازِ حقیقت نہیں تو کچھ بھی نہیں
زباں سے مہر و محبت پکارنے والو!
دلوں میں مہر و محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں

* * *

ہزار بار افق سے گذر گیا خورشید
ہوئی نہ شب مری آسودۂ سحر ساقی

* * *

دیا تھا جس نے گداؤں کو قیصری کا دماغ
بدل گیا وہ مذاقِ نظر تو کیا ہوگا؟

رات پیمانۂ مہتاب چرا لائی ہے　　اب مناسب ہے مرا بادہ گسار آجائے

* * *

ترے الطاف کے محتاج ہیں سب　　فقیہہ و رند کیا شاہ و گدا کیا

* * *

جو اپنی نظر تشنہ لبوں پر نہیں رکھتا　　اُس ساقیٔ کم ظرف کو محفل سے اٹھا دو

* * *

شبستانِ جہاں میں ڈر ہے یہ انجم نشینوں کو
یہ پروانہ کہیں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے

* * *

مِنّت کشِ مضراب ہو کیوں نالۂ دل سوز　　خود ساز کو پابندِ نوا کرتے رہیں گے

* * *

دُنیا کو رہی غنچۂ تازہ کی تمنّا　　گل ہائے فسردہ کے خریدار رہے ہم

* * *

کچھ اِس انداز سے دوشیزۂ صبح بہار آئی　　مجھے یاد اپنے ویرانے کی آئی، بار بار آئی

* * *

انھیں نازِ دلبری ہے، وہ بنے ہیں جانِ محفل
نہ غزل کی آن جن میں، نہ ادائے شاعرانہ

جس سے اسرارِ چمن فاش ہوئے جاتے تھے
طبعِ صیاد پہ وہ بات گراں گذری ہے

* * *

تقدیر سے ہے زیر و زبر گرچہ کائنات
تقدیر کو بھی زیر و زبر کر سکے تو کر

* * *

کس کی نگاہِ لطف نے چھین لیا مرا سکوں
لوٹ لیا ہے کس نے دل پردۂ التفات میں

* * *

وادیٔ شوق میں کانٹوں کے سوا کچھ نہ ملا
ہم تو سمجھے تھے خیاباں ہی خیاباں ہونگے

* * *

چمن میں رہ کے ترستے ہیں آشیانے کو
وطن میں رہ کے غریب الدیار ہم بھی ہیں

* * *

اسیرانِ چمن کی چاک دامانی نہیں جاتی
کلی جب پھول بن جاتی ہے پہچانی نہیں جاتی

* * *

زندگی ایک نالۂ دلِ سوز
ایک نغمہ ہے بے نیازِ ساز
تھک گئے ہیں رہِ طلب میں قدم
اور منزل ابھی ہے دور دراز

ہے چاک چاک عروسِ بہار کا دامن ہے داغ داغ رخِ گلستاں کی زیبائی

* * *

پرانے چاند ستاروں کا ذکر کیا فاروق
نئے چراغ، نئی انجمن کی بات کرو

* * *

ہمارا ذکرِ وفا بھی اُس انجمن میں نہیں
جلے ہیں شمع کی صورت جس انجمن کے لئے

* * *

خندۂ گل میں بھی اندازِ فغاں دیکھا ہے
ہم نے ہر پھول کو خونناب فشاں دیکھا ہے

* * *

رہی ہے بجلیوں سے روشنی میرے گلستاں میں
رہا ہے بجلیوں کی زد میں اکثر آشیاں اپنا

* * *

ہم پہ الزام بیوفائی کے ہائے انداز دلربائی کے

* * *

ہو گئی مفقود جب ذوقِ تماشا سے نظر بے حجابانہ کوئی بالائے بام آیا تو کیا

زندگی بھر مجھ سے وہ ظالم تو بیگانہ رہا　　اب مرے مرنے کے بعد اُس کا پیام آیا تو کیا

* * *

چمن میں آگ لگائیں گے آتشِ گل سے　　کلی سے شعلۂ سوزاں کا کام لینا ہے

* * *

تم نے لوٹا تھا جہاں قافلۂ ذوقِ طلب　　لڑکھڑاتے ہیں قدم جب وہ دیار آتا ہے

* * *

نہیں شمع و پروانہ پر منحصر کچھ　　تری بزم میں بے زباں اور بھی ہیں

* * *

اُن سے اتنا نہ ہوا پرسشِ غم ہی کرتے
ہم سے دیکھا نہ گیا جن کا پریشاں ہونا
اپنی ہی انجمنِ شوق میں ہو نغمہ سرا
ننگ ہے غیر کی محفل میں غزلخواں ہونا

* * *

یہ کس چمن میں ہوائے بہار لے آئی
کلی میں حُسن نہ پھولوں میں رنگِ زیبائی
ہر اک دیار سے گزریں گے سر فروشانہ
مقامِ دار و رسن ہو کہ قیدِ تنہائی

خاک کے ذرّوں کو ناچیز سمجھنے والو
خاک کے ذرّوں میں پوشیدہ جہاں ہوتا ہے
وہ جو ساقی ہوں تو انکار کی ہے کس کو مجال
وہ جو ساقی ہوں تو انکار کہاں ہوتا ہے

* * *

کس قدر اپنی طبیعت ہو گئی طوفاں پسند
دیکھ کر ساحل سفینوں کو ڈبو لیتے ہیں ہم

* * *

اُدھر ہیں سخت آدابِ محبّت
اِدھر نازک دِلوں کے آبگینے

* * *

پکارا ہے تری یادوں نے اکثر
خیالوں نے ترے آواز دی ہے
نگاہِ حُسن ٹھہری ہے جہاں بھی
وہیں رفتارِ عالم رُک گئی ہے
چراغِ ماہ و انجم بجھ رہے ہیں
مگر شمعِ تمنّا جل رہی ہے

* * *

ملا ہے منزلِ جاناں کا رہرؤں کو سُراغ
نہ کیوں ہو خاک نشینوں کا آسماں پہ دماغ
کبھی جبینِ سحر پر، کبھی دلِ شب میں
چمک رہا ہے ازل سے مرے سجود کا داغ

* * *

در پردہ تھے وہ زخمِ تکلّم لئے ہوئے
جو پھول زیرِ لب تھے تبسّم لئے ہوئے

کس قیامت کے انقلاب آئے ذرّے بن بن کے آفتاب آئے

* * *

کشتی ہوئی کنارے سے ٹکرا کے پاش پاش
ساحل بھی میرے واسطے طوفاں سے کم نہیں
تیرا جمال ماہ و ستاروں سے بھی جمیل
تیری نگاہ گردشِ دوراں سے کم نہیں

* * *

حریفِ دردِ زمانہ ہے اک تبسّمِ شوق جوابِ گردشِ دوراں ہے ایک گردشِ جام
خزاں نصیب بہاروں پہ ناز کیسے کروں ہے میرے سامنے خورشیدِ شام کا انجام

* * *

لٹا رہے ہیں متاعِ خرد کو فرزانے جنوں کو بیچتے پھرتے ہیں خود ہی دیوانے
گذر کے آئے ہیں ان منزلوں سے اہلِ جنوں بھٹک رہے ہیں جہاں مدتوں سے فرزانے
تری ہنسی پہ تصدق سکوتِ لالہ و گل تری نگاہ پہ قرباں ہزار میخانے

* * *

مری داستانِ قفس نہ کہہ مری داستانِ ستم نہ سن
جو بچے تھے شعلۂ برق سے وہ جلے ہیں سوزِ تمام سے

* * *

قائم ترا وجود ہے خود میرے شوق سے — خود میرے سنگِ در سے ترا آستاں بنا

* * *

جنوں کی روشنی لے کر نگاہ بانِ حیات — حدودِ ظلمتِ وہم و گماں سے گذرے ہیں
چراغ بن کے جب لے ہیں رہِ تمنا میں — بہار بن کے ترے گلستاں سے گذرے ہیں
مسافرانِ حرم کو خبر نہیں اب تک — بلاکشانِ محبت کہاں سے گذرے ہیں

* * *

قفس سے آئے تو شعلوں کا تذکرہ پایا — خیال یہ تھا بہاروں کی گفتگو کرتے
اگر تھا ہم سے گلہ بھی تو بر ملا ہوتا — اگر تھی ہم سے شکایت تو رو برو کرتے
یہ اجتناب مناسب نہیں، نہیں ساقی — زبان سوکھ گئی ہے سبو سبو کرتے

* * *

عقل و خرد کے مرحلے طے کر لئے تو کیا — وہم و گماں کے مرحلے سر کر سکے تو کر
پھولوں میں شب گذارنا مشکل نہیں کوئی — کانٹوں پہ کوئی رات بسر کر سکے تو کر

* * *

خواجہ عبد الحمید عرفانی

(ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید عرفانی،
پی، ایچ، ڈی۔
مدیر ہلال

میں تیری نذر کو لایا ہُوں آبگینۂ دِل
یہی ہے مایۂ درویش ارمغاں کے لئے
بشیر فاروق

آبگینۂ دِل

"مینائے غزل" آپ کے سامنے ہے۔ اِس میں بادۂ کہن ہے یا صہبائے نو؟ اِس کا فیصلہ آپ کریں گے اور یہ بھی کہ نشۂ تند ہے یا تیز۔ مَیں نے انصاف کے کشانِ سخن اور جرعہ خوارانِ شعر کے سپرد کر دیا ہے۔ بہر حال ایک سرمستِ خمارِ غزل نے اپنے افکارِ پریشاں اور تجرباتِ روحانی کو شعر کی صورت دی ہے۔ کِسے معلوم کہ بدنصیب شاعر گیسوئے ادب کو سنوارنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے، اِنسانی سعی و عمل اور فکر و نظر کا کوئی پیمانہ مکمل نہیں، بلکہ یہ نقص ہی اُس کی تکمیل کی دلیل ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ مجموعہ نقائص سے کِسی طرح مُبرا نہیں، اور شاید دُنیا کا بڑے سے بڑا شاعر بھی اِس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُس کا کلام صحیفۂ الہام کی حیثیت رکھتا ہے چہ جائیکہ مجھ ایسا نو آموزِ سخن۔

شعر کہنے کے لئے عشق کرنا ضروری ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ عشق سے میرا مفہوم کیا ہے؟ عشق بڑی وسیع اور ہمہ گیر اصطلاح ہے۔ عشق کِسی پیکرِ رنگ و بُو ہی سے نہیں

ہوتا بعض مقاصد و نظریات سے بھی ہوتا ہے۔ اور اسی شدت و تپش کے ساتھ جو لیلےٰ کے لئے قیس اپنے دل میں محسوس کرتا تھا، میری شاعری کا محبوب کون ہے؛ میرے لئے مناسب نہیں کہ میں اپنی لیلائے آرزو اور سلمائے تمنا کی خود نقاب کشائی کروں! یہ فرض مجھ سے بہتر طور پر چند اہلِ نظر نے انجام دیا ہے، جنھوں نے اس مجموعے پر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے، روشنی (یا تاریکی) ڈالی ہے۔

شاعری، گرد و پیش کے سماجی اور روحانی محرکات کی عکاسی اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کا نام ہے۔ ہم ایک غمزدہ اور مایوس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس غمزدہ اور مایوس دنیا کے دکھوں، خوشیوں، حقیقتوں اور خوابوں کو اپنے اشعار کے ذریعہ پیش کریں، لیکن یہ کام گہرے سوز و گداز اور روحانی کرب کے بغیر ممکن نہیں میرا عقیدہ ہے کہ انسانوں کی عظیم جماعتوں کو ماحول سے نبرد آزما ہونے کے لئے ابھارا جا سکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے عالمِ انسانی کو پیامِ امن اور دعوتِ انقلاب دونوں دی جا سکتی ہیں۔ یہ شاعر کا کام ہے کہ وہ ان مقاصد کو نظم کا جامہ پہناتا ہے یا غزل کا۔ بہرحال شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ روحانی اور ذہنی تجربات بیان کرنے کے ساتھ زندگی کے تلخ سماجی حقائق کو بھی اپنے کلام کے ذریعہ پیش کرے۔ البتہ اہم ترین سوال یہ ہے کہ پیش کش کا طرز اور اظہار کا اسلوب کیا ہو۔ غالب کہتے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

میں نے "مشاہدۂ حق" اور "مناقشۂ باطل" کی گفتگو کے لئے "بادہ و ساغر" یعنی غزل کا انتخاب کیا ہے۔ شاید بعض حضرات "غزل" کو اس مقصد کا اہل نہ سمجھیں، لیکن میرا شعری تجربہ یہ ہے کہ غزل ہر طرح کے نازک مضامین کو ادا کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے اور اُس کی ہمہ گیری اور بیانیہ صلاحیت ہر اعتبار سے مکمل اور منظم ہے۔

غزل کے مزاج میں غمِ جاناں کے پہلو بہ پہلو غمِ دوراں کی شمولیت بھی ناگزیر ہے۔ وہ لیلائے غزل ہی نہیں جس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر محمود و ایاز، دونوں طبقات نہ ہو۔ جو حدیثِ دل کی ترجمانی کے ساتھ حدیثِ دیگراں کو بھی پیش کرنے کی اہلیت نہ رکھتی ہو، وہ "مینائے غزل" ہی کیا جس میں حقیقتِ کائنات کی صہبائے سرمدی کے ساتھ تلخابۂ حیات بھی موجود نہ ہو۔ مختصر یہ کہ میری نظر میں غزل ایک روحانی پیغام بھی ہے اور ایک انقلابی اقدام بھی۔ یہ فرض شاعر کا ہے کہ غزل کی ان صلاحیتوں اور اہلیتوں سے بھرپور فائدہ اُٹھا سکے۔ بلاشبہ غزل کی معنویت کو اُجاگر کرنے کے لئے قلبِ خونچکاں اور دلِ بسمل کی ضرورت ہے کیونکہ جو نغمے شکستہ ساز سے نکلتے ہیں وہ پابندِ ساز نہیں ہوتے بلکہ خود ساز کو اپنا پابند بنا لیتے ہیں۔ یہ ہے مختصر ترین الفاظ میں میرا نظریۂ شعر یا عقیدۂ غزل!

ایک شاعر ہی جان سکتا ہے کہ گلشنِ شعر کی آبیاری کے لئے کتنا خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر تشبیہات، استعارات، مضامین اور اسالیبِ بیان میں زندگی، تازگی اور رنگینی پیدا ہوتی ہے۔

مجھے اپنے مجموعۂ کلام "میناۓ غزل" کے سلسلے میں ایک بات اور بھی عرض کرنی ہے، وہ یہ کہ اس میں بعض غزلیات میرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ، سیمابؔ، جگرؔ اور فیضؔ کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ مگر اس امر کا اظہار بھی بیجا نہ ہوگا کہ اس قسم کی تمام غزلیات کسی مشاعرے کی مجبوری، اور کسی مصرعِ طرح کی پابندی کا نتیجہ ہیں، ورنہ میں فطرتاً اور طبعاً کسی کی تقلید کا قائل نہیں۔

احسان فراموشی ہوگی اگر اس مجموعے کی پیش کش کے ساتھ حضرتِ جگرؔ مرادآبادی، حضرتِ رئیسؔ امروہوی اور ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی کا شکریہ ادا نہ کروں، جنھوں نے ازراہِ کرم میرے کلام کے بارے میں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائی۔

آخر میں مجھے اپنے دوست اور رفیقِ محترم نجم الدّین ولی بھائی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جن کی تحریک و تشویق سے یہ کتاب منظرِ عام پر آسکی۔

بشیر فاروق

صبرِ ایوبیؒ[۱]

اک جہادِ عزم جانبازوں کے کام آ ہی گیا
اک مجاہد لے کے تیغِ بے نیام آ ہی گیا

وہ ستم پرور کہ تھا اوجِ فلک پر محوِ سیر
وہ ستم پرور بھی آخر زیرِ دام آ ہی گیا

جن کو آئینِ وفا کا احترام آتا نہ تھا
اُن کو آئینِ وفا کا احترام آ ہی گیا

دشمنانِ میکدہ بزمِ وفا سے اُٹھ گئے
تشنہ کاموں کے لئے گردش میں جام آ ہی گیا

ایک مدّت سے بھٹکتا پھر رہا تھا کارواں
جستجو تھی جس کی اب تک وہ مقام آ ہی گیا

کس کی طاقت ہے کہ اب جمہور سے الجھے کوئی
غازیوں کے ہاتھ میں آخر نظام آ ہی گیا

---

[۱] یہ نظم ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے خوشگوار انقلاب کے موقع پر کہی گئی اور صدرِ پاکستان جناب جنرل محمد ایوب خاں کی خدمت میں بخلوص و عقیدت نذر کی گئی۔

مُژدہ باد لے انقلابِ نو! کہ اک مُدّت کے بعد
اہلِ حق کے واسطے حق کا پیام آ ہی گیا
ظالمو! سُن لو کہ ظلم و جبر اب ممکن نہیں
سرکشو! جاگو کہ وقتِ انتقام آ ہی گیا
رنگ لا کر ہی رہی فاروق آہ نیم شب
"صبرِ ایوبی" وفا کیشوں کے کام آ ہی گیا

○

معبودِ حقیقی

ہے اپنے ہی نامۂ اعمال پہ موقوف
جنت کے نظارے ہوں کہ دوزخ کے شرارے
ہر شخص کی سُنتا ہے وہ معبودِ حقیقی
انسان بشرطیکہ اُسے دل سے پکارے

○

ساقی

گذر رہی ہے مری زیست تلخ تر ساقی
شرابِ تند سے جامِ نشاط بھر ساقی

نہ ذکر چھیڑ زمانے کی کم نگاہی کا
فریبِ پیرِ مغاں کی نہ بات کر ساقی

ہزار بار فلک سے گذر گیا خورشید
ہوئی نہ شب مری آسودۂ سحر ساقی

مجھے یہ گردشِ دوراں کہاں پہ لے آئی
نہ خوش ہیں قافلے والے نہ راہبر ساقی

ہزار لعل و گہر سے جو بیش قیمت ہیں
میں تیری نذر کو لایا ہوں وہ گہر ساقی

لُٹا ہے شوق کی وادی میں کاروانِ حیات
کسی کی یاد میں تڑپا ہوں عمر بھر ساقی

ستم تو یہ ہے کہ اِس میکدے میں اب فاروقؔ
نہ رندِ اہلِ نظر ہیں نہ دیدہ ورِ ساقی

مہر و محبّت

جنوں نوازِ طبیعت نہیں تو کچھ بھی نہیں
فسوں طرازِ حقیقت نہیں تو کچھ بھی نہیں
زباں سے مہر و محبّت پکارنے والو
دلوں میں مہر و محبّت نہیں تو کچھ بھی نہیں

صبحِ بہاراں

گئی نہ اُن کی طلب عمر بھر تو کیا ہو گا
نہ کم ہُوا مرا سوزِ جگر تو کیا ہو گا

دُعائیں صبحِ بہاراں کی مانگنے والو
نہ راس آئیں بہاریں اگر تو کیا ہو گا

بسر ہوئے تھے جہاں زندگی کے شام و سحر
وہ یاد آ گئے دیوار و دَر تو کیا ہو گا

دیا تھا جس نے گداؤں کو قیصری کا دماغ
بدل گیا وہ مذاقِ نظر تو کیا ہو گا

یہ ظلمتیں، یہ کٹھن راستے، یہ تیرہ شبی
بھٹک کے رہ گیا میرِ سفر تو کیا ہو گا

دلیلِ صبح سہی ڈوبتے ہوئے تارے
ہوئی نہ پھر بھی نمودِ سحر تو کیا ہو گا

مچل رہے ہیں جو اہلِ وفا کے سینوں میں
بھڑک اُٹھے وہی شعلے اگر تو کیا ہوگا

بہت ہے لذّتِ غم پر جنون و عشق کو ناز
ہُوا نہ غم بھی مرا چارہ گر تو کیا ہوگا

گہر کی شان ہی آبِ گہر ہے فاروقؔ
رہی گہر میں نہ آبِ گہر تو کیا ہوگا

○

رزم گہِ زیست

عشقِ خوددار بھی ہے صاحبِ ادراک بھی ہے
روحِ تخلیق بھی ہے محرمِ لولاک بھی ہے
بارہا رزم گہِ زیست میں دیکھا فاروقؔ
شاخِ نمناک بھی ہے شعلۂ بیباک بھی ہے

○

تیشۂ فرہاد

خزاں قبول، بقائے گل و سمن کے لئے
مٹیں گے شوق سے رعنائیٔ چمن کے لئے
ہمارا ذکرِ وفا بھی اُس انجمن میں نہیں
جلے ہیں شمع کی صورت جس انجمن کے لئے
میں اس کو صبحِ بہاراں کا نام دُوں کیونکر
ترس رہا ہے جنوں آج پیرہن کے لئے
تلاشِ تیشۂ فرہاد کیا کرے کوئی
قدم قدم پہ ہیں کہسار کوہکن کے لئے
یہ کیسی صبحِ درخشاں وطن میں آئی ہے
ترس گئے ہیں سویرے کرن کرن کے لئے
اُس انجمن پہ اندھیرے ہیں آج بھی غالب
بجھے چراغ ہزاروں جس انجمن کے لئے

دیارِ غیر میں پھرتے رہیں اہلِ غم فاروق
بہارِ رفتہ کی خاطر غمِ وطن کے لئے

فطرتِ عشق

فطرتِ عشق بجز ذوقِ وفا کچھ بھی نہیں
دولتِ حسن بجز ناز و ادا کچھ بھی نہیں
عشق میں سوز بھی ہے ساز بھی ہے درد بھی ہے
حسن خود بینیٔ جلوہ کے سوا کچھ بھی نہیں

مینائے غزل

پھر مئے تلخ سے بھر ساغر و مینائے غزل
خالی از نشہ ہے اک عمر سے صہبائے غزل

بادۂ نو میں کہاں مستیٔ صہبائے کہن
جلوۂ نو میں کہاں شوخیٔ سلمائے غزل

جس کے ہر گھونٹ میں مستی ہے حیاتِ نو کی
میری مینائے سخن میں ہے وہ صہبائے غزل

ناز کرتا ہے بجا جس پہ گلستانِ ادب
مَیں تری نذر کو لایا ہوں وہ گلہائے غزل

اور نکھریں گے ابھی علم و ادب کے جلوے
اور بکھریں گے ابھی گیسوئے لیلائے غزل

جس کی شوخی نے لیا بادۂ شیراز سے باج
پھر وہی جام عطا کر بہ تقاضائے غزل

حافظ و غالب و اقبال کے افکارِ جمیل
مایۂ شعر و سخن، غازۂ زیبائے غزل

○

معصوم کنول

واقعہ یہ ہے کہ اے شاہدِ خلوت کدۂ شوق
دل کو یوں تیرے تصور سے سکوں ملتا ہے
جیسے ہنگامِ سحر بادِ سحرگاہی سے
سینۂ آب پہ معصوم کنول کھلتا ہے

○

چراغِ شام

عروسِ لالہ و گل سے سلام لینا ہے
رَوِش رَوِش کی زباں سے پیام لینا ہے
چمن میں آگ لگائیں گے آتشِ گل سے
کلی سے شعلۂ سوزاں کا کام لینا ہے
حیاتِ لالہ سے سیکھیں گے دِل کا خوں کرنا
چراغِ شام سے سوزِ دوام لینا ہے
سکوتِ غم کو خوشی کا پیام بخشیں گے
نوائے تلخ سے لطفِ کلام لینا ہے
طلب کریں گے گلوں سے غرورِ رعنائی
نسیمِ صبح سے ذوقِ خرام لینا ہے
غرورِ ناز مبارک ہو خود پرستوں کو
ہمیں تو عجزِ محبّت سے کام لینا ہے

وفا کی سرد کلامی تو کام آ نہ سکی
جنوں کی گرم نگاہی سے کام لینا ہے

رنگ و بو

نکھرتی ہیں بہاریں ترے رنگ و بو سے
وقارِ غنچہ و گل ہے ترے نمو سے
اثر سے ہے جلائے شیشۂ دل
گہر بنتا ہے قطرۂ آرزو سے

سازِ خموشی

ماہ و انجم کے نہ شرمندۂ احساں ہونگے
ہم تو خود اپنی تجلّی سے درخشاں ہونگے

وادئ شوق میں کانٹوں کے سوا کچھ نہ مِلا
ہم تو سمجھے تھے خیاباں ہی خیاباں ہوں گے

بجلیاں کہتے ہیں گلشن کی محافظ ہوں گی
برہمن سُنتے ہیں کعبے کے نگہباں ہوں گے

آنکھ نمناک، زباں بند، مسرّت موہوم
کس کو معلوم تھا یہ شوق کے عنواں ہوں گے

خامشی ساز بنے گی غمِ تنہائی کا
اور ہم سازِ خموشی پہ غزلخواں ہوں گے

شورشِ وحشتِ دَوراں کی شکایت کیسی
جب بہار آئے گی خود چاک گریباں ہوں گے

کیوں سراسیمہ ہو فاروق اجل سے پہلے
مرحلے گردشِ ہستی کے نہ آساں ہوں گے

غمِ آشیاں

دل شکوہ ریز گردشِ دورِ زماں نہیں
لب آشنائے نالہ و آہ و فغاں نہیں
ہر بار شاخِ نو پہ بنائیں گے آشیاں
سو بار بھی جلے تو غمِ آشیاں نہیں

قافلۂ شوق وطلب

گیسوئے شاھدِ ہستی کو سنوار آتا ہے
کوئی آشفتۂ غم جب بہ سرِ دار آتا ہے

ماہ و خورشید کا ہوتا ہے کہیں ذِکر اگر
بے حجابانہ خیالِ رُخِ یار آتا ہے

بے نیازی پہ کسی کی مجھے آتی ہے ہنسی
خود فریبی پہ کسی کی مجھے پیار آتا ہے

زخم کھِل جاتے ہیں آتی ہے اگر یادِ خزاں
دِل لرز اُٹھتا ہے جب ذکرِ بہار آتا ہے

تم نے لُوٹا تھا جہاں قافلۂ شوق وطلب
لڑکھڑاتے ہیں قدم جب وہ دیار آتا ہے

پھر اُسی مے کو ترستی ہے مری تشنہ لبی
بن پئے جس سے نگاہوں میں خمار آتا ہے

شدّتِ غم سے ہی تسکین ملی ہے فاروق
بیقراری سے مرے دِل کو قرار آتا ہے

مہ و انجم

کہیں سرمایہ داری ہے کہیں ہے نظمِ چنگیزی
یہ دنیا اب تو چنگیزوں کی محفل ہوتی جاتی ہے
مہ و انجم فروزاں ہیں ابھی کچھ رات باقی ہے
الٰہی کیوں فسردہ شمعِ محفل ہوتی جاتی ہے

پابندِ نوا

ہم سجدۂ تسلیم ادا کرتے رہیں گے
سر دے کے بھی تجدیدِ وفا کرتے رہیں گے

منّت کشِ مضراب ہو کیوں نالۂ دِل سوز
خود ساز کو پابندِ نوا کرتے رہیں گے

ہم صبر کے خوگر ہیں وفا شیوہ ہے اپنا
وہ جبر کے پیکر ہیں جفا کرتے رہیں گے

ہر مرحلۂ شوق و تمنّا سے گذر کر
تکمیلِ جنوں آبلہ پا کرتے رہیں گے

ظلمت کدۂ دہر کو بخشیں گے نئی صبح
ہم چاک شبِ غم کی قبا کرتے رہیں گے

ہر چیز ہے دُنیا کی محبّت کے سوا ہیچ
ہر چیز محبّت پہ فِدا کرتے رہیں گے

فاروق قلم ہو گا اگر سر بھی ہمارا
ہم تذکرۂ مہر و وفا کرتے رہیں گے

موجِ بلا

عبث شکوہ ہے تجھ کو ناخدا سے
الجھ جا تیری موجِ بلا سے
ذرا آئینۂ آفاق میں دیکھ
جہاں قائم ہے تیری ہی ادا سے

شائستۂ محفل

فراقِ دوست کے قابل نہیں ہے
وہ دِل جو خوگرِ مشکل نہیں ہے
کوئی یہ ناخداؤں کو بتا دے
محبّت موج ہے ساحل نہیں ہے
گریباں چاک ہے اپنا نہ دامن
ابھی شائد جنوں کامل نہیں ہے
ہے منزل اور بھی منزل سے آگے
یہ منزل آخری منزل نہیں ہے
بھلا وہ زندگی کیا ہے کہ جس میں
ترا لطف و کرم شامل نہیں ہے
خرد اُلجھی ہوئی ہے پیچ و خم میں
جنوں شائستۂ محفل نہیں ہے

مجھے ڈر ہم نواؤں سے ہے فاروق
مجھے اندیشۂ باطل نہیں ہے

○

ستارے

وہ ستارے سحر کی نذر ہوئے
ناز کرتے تھے جب ستاروں پر
جب کبھی چاند مسکراتا ہے
چوٹ لگتی ہے دل کے تاروں پر

○

میری داستاں

زباں مجبور ہے لب پر فغاں ہے
سراپا درد میری داستاں ہے
نگاہِ یار بھی ہے بدگماں سی
غرورِ حُسن بھی دامن کشاں ہے
فراقِ دوست کا کیا ذکر آخر
وصالِ یار بھی دِل پر گراں ہے
جہاں پر بات کرنا ہے قیامت
وہاں فریاد کی جُرأت کہاں ہے
مرا غم ہے مرا سرمایۂ زلیست
مرا ہر اشک میرا ترجماں ہے
خُمار آلودہ نظروں میں ہے جو کیف
وہ ساقی تیرے ساغر میں کہاں ہے

اگر مئے حسن ہے تو عشقِ فاروق
خمارِ بادۂ شعلہ فشاں ہے

○

ساقی

اب ستاروں میں وہ تابانی و رعنائی کہاں
اب ستاروں میں وہ اندازِ خنوں تابی نہیں

تشنگانِ میکدہ پر جس کا جی جلتا نہ ہو
وہ مرا ساقی نہیں ہے، وہ مرا ساقی نہیں

○

سازِ شکستہ

دلِ بے مُدعا کا مُدعا کیا
کسی سازِ شکستہ کی صدا کیا
لرز جاتا ہُوں ذکرِ آرزو سے
یہی ہے آرزوؤں کا صِلا کیا
وفا ناآشنا سے کیا شِکایت
فسُوں پرور نگاہوں سے گِلا کیا
تموّج ہے، نہ طغیانی، نہ گرداب
یہ دریائے محبّت کو ہُوا کیا
گریباں چاک ہیں ہم بھی چمن میں
خبر تجھ کو نہیں بادِ صبا کیا؟
دلِ مجبور کا سرمایۂ زیست
فغانِ صبح گاہی کے سِوا کیا

شہیدانِ وفا سے کوئی پوچھے
محبّت کیا ہے، تسلیم و رِضا کیا
ہوائے تیز بھی آئے تو کیا غم
بُجھا کرتی ہے قِندیلِ وَفا کیا
ترے الطاف کے محتاج ہیں سب
فقیہہ و رِند کیا، شاہ و گدا کیا
مرے دِل سے کوئی فاروق پوچھے
جَفا کیا ہے، تغافل کیا، اَدا کیا

○

بادِ سموم

ہنسی نہ غنچۂ گلِ سرو و سمن تو کیا ہوگا
خزاں چمن پہ رہی خندہ زن تو کیا ہوگا
کوئی بتائے کہ بادِ سموم سے فاروق
بجھا چراغِ بہارِ چمن تو کیا ہوگا

○

جراءتِ رندانہ

اُسیرانِ چمن کی چاک دامانی نہیں جاتی
کلی جب پھول بن جاتی ہے پہچانی نہیں جاتی

تری محفل سے پہلے بھی پریشانی مقدر تھی
تری محفل میں آکر بھی پریشانی نہیں جاتی

اُٹھا لو جام بڑھ کر جرأتِ رندانہ کہتی ہے
یہاں رندانِ کم آمیز کی مانی نہیں جاتی

جلایا اس طرح برقِ حوادث نے گلستاں کو
کہ شاخِ آشیاں بھی ہم سے پہچانی نہیں جاتی

نگاہِ شوق تھی جو آئینہ اَسرارِ عالم کا
مثالِ چشمِ نرگس اس کی حیرانی نہیں جاتی

نہ جانے زندگی نے کتنے میخانے لُنڈھا ڈالے
مگر اہلِ طلب کی تشنہ سامانی نہیں جاتی

وہ بربادِ تمنّا ہوں، وہ برگشتہ مُقدّر ہوں
بہاروں میں بھی جس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

گریباں چاک ہے، دامن دریدہ ہے، جگر خوں ہے
عروسِ گل کی لیکن خندہ سامانی نہیں جاتی

منزل

مری ہستی کسی کی ترجماں ہے
مری خاطر متاعِ دو جہاں ہے
مگر مجھ کو نہیں اتنی خبر بھی
کہاں میں ہوں، مری منزل کہاں ہے

نئی بجلیاں

چمک رہی ہیں نئی بجلیاں اندھیروں میں
طیورِ باغ کو تسکیں کہاں بسیروں میں
وہ صبحیں آج ہے جن پر گمان ظلمتِ شام
شمار ہوتا تھا ان کا کبھی سویروں میں
یہ عارفانِ حقیقت، یہ دہشتِ باطل
یہ روبہی کی ادائیں خدا کے شیروں میں
پیامِ صبح دیا تھا جنوں نے منزل کو
بھٹک رہے ہیں وہی قافلے اندھیروں میں
اُمید جن سے تھی فاروق رہنمائی کی
خدا کی شان کہ نکلے وہی لٹیروں میں

اسرارِ چمن

زندگی نذرِ غم و محوِ فغاں گذری ہے
عمرِ دو روزہ بہ آغوشِ خزاں گذری ہے

دن کہاں گذرا ہے تیرا مرے خورشیدِ جمال
رات تیری مرے مہتاب کہاں گذری ہے!

تھی وہی ایک گھڑی عمر کی سرمایۂ زیست
تیری محفل میں جو اے جانِ جہاں گذری ہے

پھر اسیرانِ قفس پر کوئی ٹوٹا ہے ستم
آج پھر بادِ سحر نالہ کُناں گذری ہے

جس سے اسرارِ چمن فاش ہوئے جاتے تھے
طبعِ صیاد پہ وہ بات گراں گذری ہے

تجھ کو معلوم بھی ہے جانِ وفا تیرے بغیر
زندگی کتنی سُبک، کتنی گراں گذری ہے

اپنی قسمت نہ ہوئے عارض و گیسو فاروق
محفلِ ناز میں گو عمرِ رواں گذری ہے

ابرِ بہاراں

میخانہ بنا ابرِ بہاراں سے گلستاں
یہ گل ہے، وہ ساغر ہے، یہ غنچہ وہ سبو ہے
کہتے ہیں جسے اہلِ چمن بادۂ گل رنگ
کچھ تیری جوانی ہے تو کچھ میرا لہو ہے

پسِ کارواں

جبیں کے لئے آستاں اَور بھی ہیں
تری خواجگی کے نِشاں اَور بھی ہیں
قبائے گُل و لالہ کو سینے وَالے
کئی چاک داماں یہاں اَور بھی ہیں
نہیں شمع و پروانہ پر منحصر کچھ
تری بزم میں بے زباں اَور بھی ہیں
نئی ایک منزل ہے منزل سے آگے
پسِ کارواں، کارواں اُور بھی ہیں
کوئی ناظمِ بتکدہ سے یہ کہہ دے
حرم کے ابھی پاسباں اور بھی ہیں
نہیں ہم ہی تنہا گراں مَوجِ گُل پر
مزاجِ چمن پر گراں اور بھی ہیں

ابھی بجلیاں اَور بھی ہیں فلک پر
چمن میں اُبھی آشیاں اَور بھی ہیں
نہیں ہے نسیمِ سحر ہی پریشاں
گلستاں میں آشفتہ جاں اور بھی ہیں
لَرزتا تھا ہیبت سے جن کی زمانہ
مری قوم میں وہ جواں اور بھی ہیں

○

داغِ محبّت

فریب کھا نہ فروغِ مہ و ستارہ سے
ہمارا داغِ محبّت ہے جو چمکتا ہے
شفق ہو، لالۂ رنگیں ہو، شمعِ سوزاں ہو
ہر اک میں اپنی تمنا کا خون جھلکتا ہے

○

زخمہ زن

عِشق پابندِ رسمِ عجز و نیاز
حسنِ مجبور، دلفریبیٔ ناز
رقص میں آگیا ہے عالمِ ناز
مطربِ شوق نے اُٹھایا ساز
ہر نوا عِشق کی خلِش اَفروز
ہر اَدا حُسن کی بہانہ ساز
حُسن کی انجمن نِشاط و سُرور
عِشق کی کائنات سوز و گداز
کون بنتا ہے چارہ سازِ جنوں
کون ہوتا ہے آشنائے راز
اَب نہ وہ دِل نہ وہ گدازِ کہن
اَب نہ غم ہے نہ فکرِ چارہ ساز

تھک گئے ہیں رہِ طلب میں قدم
اور منزل ابھی ہے دُور دراز
جس پہ نازاں ہے زخمہ زن فاروق
ہم بھی اُس ساز کی ہیں اک آواز

○

تفسیرِ عشق

خود سراپا عشق بن کر عشق کی تفسیر کر
بے نیاز اُٹھ کر جہاں میں فقر کی تشہیر کر
ماہ و انجم کو تو تسخیر کر لیا تو نے تو کیا
کر کبھی تو اپنی مشتِ خاک کی تسخیر کر

○

غمِ روزگار

بہار جس کے خدوخال لے کے آئی ہے
خدا کرے وہ مجسّم بہار آ جائے

اگر نہیں ہے چمن میری رہ گذاروں میں
خزاں رسیدہ کوئی لالہ زار آ جائے

وہ اپنی خوئے تلوّن اگر بدل ڈالے
یقین گردشِ لیل و نہار آ جائے

عجب نہیں ہے کہ جذبِ تبسّمِ گل سے
صبا کے دوش پہ عہدِ بہار آ جائے

غمِ حیات سے روندی ہوئی تمنّا کو
الٰہی راس غمِ روزگار آ جائے

غزل وہ چھیڑ ربابِ الم پہ اے فاروقؔ
دلِ فسردہ کو جس سے قرار آ جائے

حاصلِ سوزِ دو عالم

محبّت خوگرِ ہنگامۂ غم ہوتی جاتی ہے
تمنّا حاصلِ سوزِ دو عَالم ہوتی جاتی ہے

کوئی اعجاز دیکھے اُن کی کیف آور نگاہوں کا
طبیعت بے نیازِ ساغرِ جم ہوتی جاتی ہے

میں سُلجھاتا ہوں جتنا بھی کسی کی زلفِ برہم کو
وہ ظالم اور پُرخم اور پُرخم ہوتی جاتی ہے

ستارے ڈوبتے ہیں بڑھ رہی ہیں ظلمتیں شب کی
یہ محفل صبح سے پہلے ہی برہم ہوتی جاتی ہے

وہ رشکِ مہر و مہ اُٹھ کر گیا کیا اپنی محفل سے
مہ و انجم کی تابانی بھی مدھم ہوتی جاتی ہے

یہ کس انداز سے صبحِ بہار آئی گلستاں میں؟
اندھیرے بڑھ رہے ہیں روشنی کم ہوتی جاتی ہے

طلب تھی جس کی دل کو آگیا وہ آستاں شاید
جبینِ شوق اپنی خود بخود خم ہوتی جاتی ہے

ناخدا

جفا جن کی عادت ہو ان سے گلہ کیا
جو تھے باوفا، بے وفا ہو گئے ہیں
بھروسہ کریں کس پہ اہلِ سفینہ
جو تھے ناخدا وہ خدا ہو گئے ہیں

کفرِ ماجرا

نقش و نگارِ زیست کا ساماں نہ کر سکے
اپنا لہو جو صرفِ گلستاں نہ کر سکے
وہ کم نصیب جن کی خزاں میں کھلی تھی آنکھ
اندازۂ جمالِ بہاراں نہ کر سکے
ہر ایک نا خدا نے سفینوں پہ خیر سے
اِحسان وہ کئے ہیں جو طوفاں نہ کر سکے
اپنے بھی داغِ دِل مہ و انجم سے کم نہ تھے
یہ اور بات ہے کہ فروزاں نہ کر سکے
اِس واسطے ہر اک کو نیا غم دیا گیا
کوئی کسی کے درد کا درماں نہ کر سکے
وہ غمگسارئ غمِ دوراں کریں گے کیا
جو پاسِ خاطرِ غمِ دوراں نہ کر سکے

فاروق تم نے خود کو مسلماں تو کر لیا
اُس کفر ماجرا کو مسلماں نہ کر سکے

جبر و ستم

خِرد نا آشنا ہے کیف و کم سے
جنوں ہوتا نہیں آلودہ غم سے
مرے ذوقِ وفا سے تجھ کو نفرت
مجھے الفت ترے جبر و ستم سے

مدارِ غمِ روزگار

نہ وہ مے فروش ہوتے، نہ میں بادہ خوار ہوتا
نہ وہ مستِ ناز ہوتے، نہ مجھے خمار ہوتا

مجھے تا حیات رہتا، ترا انتظارِ پیہم
اگر اپنی زندگی پر، کوئی اعتبار ہوتا

غمِ انتظار کیا ہے، یہ رموز تجھ پہ کھُلتے
تجھے بھی کسی کا ظالم، اگر انتظار ہوتا

اُنھیں اِس قدر نہ ہوتا یہ غرورِ بے نیازی
مجھے اپنے جذبِ دل پر، اگر اختیار ہوتا

مرے شوقِ بے کراں کی کوئی انتہا نہ ہوتی
مرے حلقۂ جنوں کا نہ کہیں حصار ہوتا

انھیں حسرتوں میں گذرے مری زندگی کے لمحے
کوئی دلنواز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

یہی آرزو ہے یارب، مرے جذبۂ دُروں کی
مری ذات پر مدارِ غمِ روزگار ہوتا
کوئی جَلوہ ریز ہوتا مری بزمِ آرزو میں
مرے دِل کی انجمن میں کوئی نغمہ بار ہوتا

کیفِ غم

حرم کیا ہے، روایاتِ حرم کیا
کرم کیا ہے تقاضائے کرم کیا
جو ہو بیگانۂ رعنائیٔ غم
وہ ہوگا آشنائے کیفِ غم کیا

صبحِ بہار

فریب خوردۂ صبحِ بہار ہم بھی ہیں
ہلاکِ گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں
چمن میں رہ کے ترستے ہیں آشیانے کو
وطن میں رہ کے غریب الدیار ہم بھی ہیں
نہیں ہے قلب و جگر داغ داغ لالے کا
غمِ فراق سے سینہ فگار ہم بھی ہیں
برنگِ شعلہ نہیں ہے قرار اُن کو اگر
مثالِ نکہتِ گل بے قرار ہم بھی ہیں
ہمارے دل کو بھی حسرت ہے پھول بننے کی
تری نظر میں نسیمِ بہار ہم بھی ہیں؟
گراں نہیں ہے مزاجِ چمن پہ موجِ نسیم
کسی کی خاطرِ نازک پہ بار ہم بھی ہیں

جس انقلاب سے دُنیا میں اِنقلاب آیا
اُس انقلاب کے پروردگار ہم بھی ہیں
ستم کشانِ جہاں کی پکار تم ہی نہیں
ستم کشانِ جہاں کی پکار ہم بھی ہیں

مقصدِ تخلیقِ ہستی

کبھی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا بن
کبھی سازِ شکستہ کی نوا بن
یہی ہے مقصدِ تخلیقِ ہستی
سراپا سوز بن، درد آشنا بن

آدابِ وفا

ذرّوں کو حریفِ مہ و خورشید بنا دو
اِنسان کی راہوں میں سِتاروں کو بچھا دو

وہ زلفِ سیہ پوش کہ ہے جس سے اندھیرا
خورشیدِ جہاں تاب کے چہرے سے ہٹا دو

طوفان و حوادث کی شکایات کہاں تک
طوفان و حوادِث سے سفینوں کو لڑا دو

جو اپنی نظر تشنہ لبوں پر نہیں رکھتا
اُس ساقیِ کم ظرف کو محفِل سے اُٹھا دو

پرویزیٔ پرویز ہے کچھ روز کی مہماں
دارایٔ دارا کے غلاموں کو بتا دو

گلشن سے محبّت ہے تو اے اہلِ گلستاں
تفریقِ گل و لالہ گلستاں سے مٹا دو

دُنیا کو دِکھا دو کہ ہو تم جبر کے خُوگر
آدابِ وَفا جبر کے خوگر سِکھا دو
فاروق فقط مقصدِ تخلیق یہی ہے
اِنسان کو اِنساں کا پرستار بنا دو

○

خواہش

مجھ کو خواہش یہ نہیں ہے کہ تو اکبر کر دے
یہ بھی حسرت نہیں دل میں کہ سکندر کر دے
ہاں مگر آرزوئے شوق یہی ہے یارب!
میرے کردار کے قطرے کو سمندر کر دے

○

دار و رسن

دیارِ عشق میں دار و رسن کی بات کرو
ہر ابتلا میں دلِ کوہ کن کی بات کرو

ملی ہے منزلِ جاناں جسے بغیرِ سفر
کبھی کبھی تو اُسی راہزن کی بات کرو

خرد کی سحر طرازی کا تذکرہ کبتک
جنوں کے جذبۂ خیبر شکن کی بات کرو

ہمارے حالِ پریشاں کا ذکر جانے دو
کسی کی زلفِ شکن در شکن کی بات کرو

کرو نہ بات غریب الدّیار کی یارو
وطن سے آئے ہو اہلِ وطن کی بات کرو

سُنا گئے ہیں بہت خار و خس کے افسانے
اب آرزو ہے کہ سرو سمن کی بات کرو

سُنی ہیں ہم نے امارت کی داستانیں بہت
کِسی غریب کے رَنج و محن کی بات کرو
پُرانے چاند سِتاروں کا ذِکر کیا فاروق
نئے چراغ نئی انجمن کی بات کرو

○

اِنقلاب

اِس جہانِ رنگ و بو پر جوشِ شباب آیا تو کیا
ڈوب کر پھر آسماں پر آفتاب آیا تو کیا
گر تری دُنیائے دِل میں اِنقلاب آیا نہیں
ذرّے ذرّے پر جہاں کے اِنقلاب آیا تو کیا

○

شانِ دلنوازی

تری دِلنوازیوں کو نہ سمجھ سکا زمانہ
کبھی شانِ دلنوازی، کبھی رنگِ قاہرانہ

تری ہر اَدا سے ظاہر ترا ذوقِ خود نمائی
مری خامشی میں پنہاں مرے دَرد کا فسانہ

مجھے گلشنِ جہاں میں نہ سُکوں ہوا میسر
کبھی باغباں کا خطرہ، کبھی فکرِ آشیانہ

کھُلیں کس طرح اب آخر غم روز و شب کے عقدے
نہ وہ آہِ صبح گاہی، نہ وہ نالۂ شبانہ

یہ گھُٹی گھُٹی سی آہیں، یہ رُکے رُکے سے آنسو
مری داستانِ فرقت، مرے ہجر کا فسانہ

جہاں مسکرادیئے وہ، وہیں مسکرادیئے ہم
جہاں وہ ٹھہر گئے ہیں، وہیں رُک گیا زمانہ

جنھیں اپنی انجمن میں مرے ذکر سے تھی نفرت
وہ سنا رہے ہیں یارب مرا غم فزا فسانہ

نہ فروغِ جذبۂ دل، نہ ضیائے شمعِ محفل
نہ وہ جلوۂ کہن ہے، نہ وہ سوزِ جاودانہ

انھیں نازِ دلبری ہے وہ بنے ہیں جانِ محفل
نہ غزل کی آن جن میں، نہ ادائے شاعرانہ

○

بھول گئے

ہائے وہ شانِ تغافل کہ خدا بھول گئے
زہرِ غم دے کے وہ خود اسکی دوا بھول گئے

اہلِ گلشن پہ ستم اتنے کسی نے توڑے
دورِ صیاد کے سب جور و جفا بھول گئے

○

شعلۂ درد

عِشق ہے بندۂ آزاد کا مقصودِ حیات
عقلِ بُت گر نے تراشے ہیں ہزاروں معبود
وسعتیں اَور عطا عرصۂ آفاق کو کر
تنگ ہے میکر جنوں پر یہ جہانِ محدود
فوقیت دیتے ہیں مذہب پہ جو قومیت کو
اُن کا اِدراک معطّل ہے بصیرت محدود
اَب کہاں حسنِ خود آرا میں خمِ زلفِ ایاز
اَب کہاں عشق کے مسلک میں طریقِ محمود
نہ وہ منزل گہِ مجنوں ہے نہ وہ وادیِ نجد
رہ رَوِ شوق و تمنّا کی ہیں راہیں مسدود
ذہن میں اُن کے کہاں شعلۂ تخلیقِ سخن ؟
جو یہ کہتے ہیں کہ اُفکار پہ طاری ہے جمود

شمعِ ایوانِ طرب قسمتِ منعم فاروق
دلِ مجبور کی تقدیر فقط شعلۂ دُود

ساحل

طوفاں شناس ہوں مجھے موجوں سے عشق ہے
ساحل کا ہم مزاج مرا دل نہ ہو سکا
کشتی ہوئی کنارے سے ٹکرا کے پاش پاش
ساحل بھی میرے واسطے ساحل نہ ہو سکا

موجِ جنوں خیز

رنگِ رُخِ دَوراں کو نکھرنا نہیں آتا
اے زلفِ جہاں! تجھ کو سنورنا نہیں آتا
ہنس ہنس کے جو پُرخار منازل سے نہ گذرے
اُس کو رہِ ہستی سے گذرنا نہیں آتا
اُس نقش کو فطرت بھی اُبھرنے نہیں دیتی
جس نقش کو مِٹ مِٹ کے اُبھرنا نہیں آتا
زیبا ہی نہیں اُس کو لقب پیرِ مغاں کا
پیمانہ و ساغر جسے بھرنا نہیں آتا
اُس زلف سے کیا رَبط ہو اربابِ جنوں کو
جس زلف کو شانوں پہ بکھرنا نہیں آتا
تنکوں سے بھی رُکتی ہے کہیں موجِ جنوں خیز
دریائے تمنّا کو ٹھہرنا نہیں آتا

فاروق وہ پروانۂ جانباز ہی کیسا
ہنس ہنس کے جسے شمع پہ مرنا نہیں آتا

ایک سوال

کوئی ظالم ہے اور مظلوم کوئی
کوئی خادم ہے اور مخدوم کوئی
ہیں سب انسان جب یارب تو پھر کیوں
کوئی آزاد ہے، محکوم کوئی

انجمن آرا

آ! انجمنِ شوق میں اے انجمن آرا
اَب کشمکشِ ہجر نہیں دِل کو گوارا
اَے لیلئ اَیّام، تجھے یاد تو ہوگا
کِس کِس نے ترے گیسوئے بَرہم کو سنوارا
دشوار تھا بیمارِ محبّت کا سنبھلنا
مِلتا نہ اگر چشمِ فسوں گر کا سہارا
شب تیرے لئے ظلمت وآفات میں کاٹی
دِن تیرے لئے مَوج وتلاطم میں گذارا
شعلوں کو جِلا دی نفسِ بادِ سحر نے
رنگِ رُخِ ہستی کو لہو دے کے نکھارا
ہم عہدِ خزاں میں ہوئے کچھ اَور شگفتہ
دیکھے تو کوئی رَبط بہاروں سے ہمارا

مستور رہے گا شبِ ظلمات میں کب تک
یارب کسی محروم کی قسمت کا ستارا
اک وہ کہ میسر انھیں ساحل کے نظارے
اک ہم کہ مقدر میں نہ طوفاں نہ کنارا

○

لباسِ لالہ

مرا ہر اشک میرا ترجماں ہے
چمن میں جو بھی ہے محوِ فغاں ہے
لباسِ لالہ ہی خونیں نہیں ہے
گلوں کی پتّی پتّی خوں فشاں ہے

○

پیمانۂ مہتاب

چھیڑ وہ نغمۂ نو جس سے قرار آجائے
وہ مئے تلخ پلا جس سے خمار آجائے

رات پیمانۂ مہتاب چرا لائی ہے
اب مناسب ہے مرا بادہ گسار آجائے

خود بخود چاک گریباں کے سلے جاتے ہیں
اب تمنائے جنوں ہے کہ بہار آجائے

ہائے وہ اشک کہ اٹھیں جس سے تلاطم شب و روز
ہائے وہ شیشۂ دل جس پہ غبار آجائے

حسن کو شوق فقط انجمن آرائی کا
عشق کو ضد کہ کوئی بر سرِ دار آجائے

زلف و رخسار و لب یار کا ذکر آیا ہے
کاش وہ عربدۂ شعبدہ کار آجائے

اُس کی رحمت کا نہیں کوئی ٹھکانا فاروقؔ
کیا عجب مجھ سے گنہگار پہ پیار آجائے

○

چرخِ ستم کوش

کیوں گرتی ہم ہی پہ یہاں برقِ جہاں سوز
کیا ہم نے ترا چرخِ ستم کوش لیا ہے

اک ہم کہ میسر نہ ہوا ابرِ سیہ بھی
زلفوں کے کوئی سایۂ رنگیں میں جیا ہے

اک وہ ہیں کہ محروم ہیں تہذیبِ حرم سے
اک ہم ہیں کہ دامن کو ترے تھام لیا ہے

○

غازۂ چہرۂ اِقبال

ہم نے دیکھا ہے عجب تیرے جہاں کا دستور
غازۂ چہرۂ اِقبال ہے خونِ مزدور
حسنِ مغرور کی قسمت ہے جہانبانیٔ ناز
عشقِ بے چارے کی تقدیر جہانِ مجبور
جو نہ آنکھوں سے چھلکتی ہو وہ مستی کیسی
مے وہ کیا ہے جسے دیکھے سے نہ آجائے سُرور
غیرتِ عشق کا ارشاد نہ لا اُن کا خیال
دلِ ناداں کا یہ اِصرار کہ چل اُن کے حضور
صرصرِ غم سے فسردہ کبھی ہوتا ہی نہیں
رُوحِ شاعر میں جو ہے شعلۂ ادراک و شعور
ہم نے اس طرح بھی اک عمر گذاری فاروقؔ
آنکھ نمناک، جگر چاک، تمنّا مہجور

آبگینۂ دل

شعور شرط ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے
خلوص فرض ہے سالارِ کارواں کے لئے
عزیز ہوتی ہے جن کو بہار گلشن کی
وہ خوں بہاتے ہیں تزئینِ گلستاں کے لئے
سُراغ جس کا حرم دے سکا نہ بتخانے
ترس رہی ہیں جبینیں اُس آستاں کے لئے
ہزار بار لُٹے ہیں رہِ محبّت میں
ہزار بار مِٹے ہیں غمِ جہاں کے لئے
میں تیری نذر کو لایا ہُوں آبگینۂ دِل
یہی ہے مایۂ درویش ارمغاں کے لئے
یہ اور بات کہ قاتل کا ہاتھ اُٹھ نہ سکا
کیا ہے پیش گلو ہم نے امتحاں کے لئے

شرطِ وفا

تری دُنیا میں جب تک بھی جئے ہم
فریبِ آرزو کھایا کئے ہم
اگر شرطِ وفا ہے بے نیازی
تو پھر اے جانِ محفل جی لئے ہم
پریشاں ابر کی صورت بکھر کر ہیں
غبارِ کارواں بن کر جئے ہم
الہٰی خیر ہو جذب و جنوں کی
چلے ہیں شوق کی دُنیا لئے ہم
یہ تھا اِعجاز چشمِ پُر فسوں کا
ہوئے مخمور اکثر بِن پئے ہم
بُجھاتے ہیں چراغِ آرزو وہ
جلاتے ہیں محبّت کے دِیئے ہم

شرابِ ناب پینے کے لئے وہ
مگر ساقی، ترسنے کے لئے ہم

○

سیلِ جمہور

آج مجبور جھک نہیں سکتا
سیلِ جمہور رُک نہیں سکتا

اَب جو طوفان اُٹھنے والا ہے
اَب جو شعلہ بھڑکنے والا ہے

جبر و طاقت سے ٹل نہیں سکتا
حُکمِ فطرت بدل نہیں سکتا

○

فسانہ و افسوں

تمیزِ کافر و مومن خرد کی بے بصری
قیودِ دیر و حرم ہیں دلیلِ کم نظری

وہ عشق کیا کہ ہو نا آشنائے جذب و جنوں
وہ زخم کیا کہ ہو احسانمندِ چارہ گری

مجھے خلوص نے لوٹا تو کچھ مروّت نے
اداشناسِ وفا کی نہ پوچھ حیلہ گری

بغیرِ سوزِ تمنّا فسون و افسانہ
فغانِ نیم شبی ہو کہ نالۂ سحری

یہ مجھ کو کون سی منزل میں عشق لے آیا
نہ کام آئی دلِ نکتہ داں کی نکتہ وری

گلوں سے صحنِ چمن ہے ابھی تہی دامن
سکھاؤ غنچۂ تازہ کو فنِّ جامہ دری

ہوس نے دام بچھائے ہیں ہر طرف فاروق
بُتانِ عصر کی مجھ سے نہ پوچھ فتنہ گری

○

دِل

یہ دِل وہ شعلۂ غم ہے، یہ دِل وہ مشعلِ نور
طِلسمِ شام و سحر پر جو مُسکراتا ہے

کبھی یہ ناز اُٹھاتا ہے کج اَدائی کے
کبھی یہ ذَوقِ نظر کے فریب کھاتا ہے

بَڑا ہی سادہ و نازک ہے آبگینۂ دِل
جبیں کی ایک شکن سے بھی ٹوٹ جاتا ہے

○

مئے شبانہ

نگاہِ ناز میں کیا ہے جو دلبرانہ نہیں
ادائے شوق میں کیا ہے جو کافرانہ نہیں

شرابِ نَو میں یہ مانا کہ مستیاں ہیں بہت
مگر وہ کیف و سُرورِ مئے شبانہ نہیں

مری حیاتِ مسلسل اسیرِ گیسوئے غم
کسی کی زلف سے اُلجھا کبھی زمانہ نہیں

نہ جس میں سوز و تپش ہو وہ داستاں کیسی
نہ جس میں رنگِ وفا ہو مرا فسانہ نہیں

بہارِ لالہ و گل کس چمن میں لے آئی
گلوں کی بات نہیں، ذکرِ آشیانہ نہیں

یہ ساحرانہ ادائیں بتانِ مغرب کی؟
مگر نگاہ میں اندازِ محرمانہ نہیں

اُٹھائیں ناز حسینوں کے کس لئے فاروق
مزاج اپنا ازل ہی سے عاشقانہ نہیں

○

خود فریبی

خود فریبی یقیں کی محرومی
خود شناسی ہی کامرانی ہے

اپنی تقدیر خود بناتی ہیں
زندہ قوموں کی یہ نشانی ہے

اب جو خوئے وفا نہیں باقی
یہ تمدّن کی مہربانی ہے

○

سوادِ منزل

بُت نکلتے ہیں آستینوں سے
خوف آتا ہے ہم نشینوں سے
ہم ہی طوفاں سے آشنا نہ ہوئے
موج ٹکرا گئی سفینوں سے
یہ بگولے سوادِ منزل کے
کیوں الجھتے ہیں رہ نشینوں سے
بے نیازی تو اُن کی فطرت ہے
کیا شکایت ہو مہ جبینوں سے
حُسن برستا تھا جن زمینوں پر
شعلے اُٹھتے ہیں اُن زمینوں سے
شدّتِ غم سے دِل سُلگ نہ اُٹھیں
آگ نکلے نہ آبگینوں سے

سُرورِ مینائی

نہ اَب مجالِ تقاضا نہ تابِ گویائی
وہی ہے دِل بھی، وہی دل کی ناشکیبائی

یہ کِس چمن میں ہوائے بہار لے آئی
کلی میں حسن نہ پھولوں میں رنگِ زیبائی

ابھی ہے بَرق کی زد میں بہارِ لالہ و گل
ہنوز وقفِ خزاں ہے چمن کی رعنائی

جوابِ جبر و ستم اک نگاہِ کج انداز
حریفِ قیصر و کسریٰ جنوں کی گیرائی

ترے جمال پہ نازاں فروغِ ماہ و نجوم
ترے خمار پہ قرباں سرورِ مینائی

کِسی نے حال بھی پوچھا تو دِل تڑپ اٹھا
کسی نے ہنس کے پکارا تو آنکھ بھر آئی

ہر اک دیار سے گذریں گے سرفروشانہ
مقامِ دار و رسن ہو کہ قیدِ تنہائی
ہے چاک چاک عروسِ بہار کا دامن
ہے داغ داغ رخِ گلستاں کی زیبائی

اسیرِ مجاز

اِس زندگی پہ حضرتِ انساں کو ناز ہے
جس میں قدم قدم پہ نشیب و فراز ہے

سُلجھا سکے نہ جس کو زمانے کے فلسفی
اُلجھا ہُوا کچھ ایسا حقیقت کا راز ہے

اے دل اساسِ غم پہ ہی قائم ہے قصرِ زیست
سرمایۂ حیات غمِ سوز و ساز ہے

یارب دلوں سے رنگِ وفا اُڑ گیا ہی کیوں
کیوں حق شناس آج اسیرِ مجاز ہے

دورِ خزاں

جب کہیں تذکرۂ دورِ خزاں ہوتا ہے
غنچہ و گل کا تبسّم بھی گراں ہوتا ہے

خاک کے ذرّوں کو ناچیز سمجھنے والو
خاک کے ذرّوں میں مستور جہاں ہوتا ہے

اُن کے اندازِ کرم میں ہے تغافل کی جھلک
بے نیازی پہ توجہ کا گماں ہوتا ہے

بعض اوقات تو ہر نغمۂ عشرت اے دوست
لب پہ آتا ہے تو مائل بہ فغاں ہوتا ہے

وہ جو ساقی ہوں تو انکار کی ہے کس کو مجال
وہ جو ساقی ہوں تو انکار کہاں ہوتا ہے

چوٹ کھا کھا کے اُبھرتا ہے مرا جذبۂ شوق
دردِ سہ سہ کے جنوں اور جواں ہوتا ہے

خود بڑھا کرتے ہیں وہ دار و رسن کی جانب
نکتۂ صبر و رضا جن پہ عیاں ہوتا ہے
خوف آتا ہے مجھے چارہ گروں سے فاروق
رہبروں پر مجھے رہزن کا گماں ہوتا ہے

○

معرکے

نہیں سر معرکے ہوتے زباں سے
کبھی شعلے نہیں اٹھتے فغاں سے
اسیرو توڑ دو باب قفس کو
محبت ہے اگر کچھ آشیاں سے

○

زخمِ تکلم

درپردہ تھے وہ زخمِ تکلّم لئے ہوئے
جو پھول زیرِ لب تھے تبسّم لئے ہوئے

لائے نہ اپنے لب پہ شکایت کا ایک حرف
گو دِل میں تھے ہزار تلاطم لئے ہوئے

کیا پھر کوئی اسیرِ تمنّا رِہا ہُوا
مَوجِ صبا ہے لب پہ ترنم لئے ہوئے

ہر ایک پھول شعلہ بداماں ہے آج کل
ہر اک کلی ہے ذوقِ تکلّم لئے ہوئے

آیا ہے میکدۂ اِحزاں میں آج کوَن
ذرّے ہیں دِلفریبیٔ انجم لئے ہوئے

اشکِ جگر سوز

دِل کا مقسوم تھا محوِ غمِ جاناں ہونا
اِسی آئینہ سے سیکھے کوئی حیراں ہونا

اُپنی ہی انجمنِ شوق میں ہو نغمہ سرا
ننگ ہے غیر کی محفل میں غزلخواں ہونا

زندگی کیا ہے، تری یاد، ترا ذکرِ جمیل
بندگی کیا ہے ترے نام پہ قرباں ہونا

دِل یہ کہتا ہے پشیمانِ محبّت ہو جا
دَرد کہتا ہے نہ مِنّت کشِ دَرماں ہونا

اُن سے اِتنا نہ ہوا پرسشِ غم ہی کرتے
ہم سے دیکھا نہ گیا جِن کا پریشاں ہونا

مجھ کو خوش آنہ سکا غیرتِ دینی سے فرار
اُن کو راس آگیا غارت گرِ ایماں ہونا

عاشقی ضبط ہے اور ضبط ہے رعنائی زیست
عِشق کی شان نہیں چاک گریباں ہونا

مجھ کو اُن شوخ نگاہوں نے بنایا کافِر
جن کو منظور نہ تھا میرا مسلماں ہونا

ھائے اُس اَشکِ جگر سوز کی قسمت فاروقؔ
جس کی قسمت نہ ہو پلکوں پہ فروزاں ہونا

○

زَمانہ

شکووں کے دِل نشیں لمحے ہوئے ختم
عَداوت کا زمانہ آرہا ہے
بہاروں پہ خزاں منڈلا رہی ہے
اُجالوں پہ اندھیرا چھا رہا ہے

○

رُوئے گُل

رُوئے گُل کو قطرۂ شبنم سے دھو لیتے ہیں ہم
آنسوؤں سے اپنے دامن کو بِھگو لیتے ہیں ہم

بے قراری ضبط کی منزل سے بڑھ جاتی ہے جب
چُپکے چُپکے جا کے تنہائی میں رو لیتے ہیں ہم

کس قدر اپنی طبیعت ہو گئی طوفاں پسند
دیکھ کر ساحل، سفینوں کو ڈبو لیتے ہیں ہم

باوجودِ ضبط اک جانِ تمنّا کے حضور
آنسوؤں سے شوق کے موتی پرو لیتے ہیں ہم

نبضِ ہستی پر کبھی رہتی تھیں جو فطرت شناس
خون میں وہ انگلیاں اپنی ڈبو لیتے ہیں ہم

جانبِ منزل رواں ہوتی ہے جب لیلائے ناز
بن کے گردِ کارواں خود ساتھ ہو لیتے ہیں ہم

سایۂ زلفِ بُتاں میں بھی گذر جاتی ہے رات
تیغ کے سائے میں بھی فاروؔق سو لیتے ہیں ہم

○

خار و گل

جہانِ آرزو کی وادیوں میں
گلستاں ہی نہیں کہسار بھی ہیں
سنبھل کر چلئے اُلجھ جائے نہ دامن
یہاں گل ہی نہیں ہیں خار بھی ہیں

○

گرمیٔ محفل

نگاہِ واپسیں ہی عشق کا حاصل نہ بن جائے
خموشی ترجمانِ سوز و سازِ دل نہ بن جائے

شبستانِ جہاں میں ڈر ہے یہ انجم نشینوں کو
یہ پروانہ کہیں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے

جو ٹکراتی رہی ہے مدّتوں موج و تلاطم سے
وہی ٹوٹی ہوئی کشتی مرا ساحل نہ بن جائے

وہ اشکِ غم ہی کیا جس سے نہ طوفانِ بلا اٹھے
وہ ذرّہ کیا چمک کر جو مہِ کامل نہ بن جائے

تغافل آشنا ایسی بھی آخر بے نیازی کیا
کہیں دردِ محبت بڑھتے بڑھتے دل نہ بن جائے

یہی انداز ہیں گر ابتری کے، کارواں والو
کوئی رہزن ہی خضرِ جادۂ منزل نہ بن جائے

حیاتِ سرمدی

خلش ہے، درد ہے، آشفتگی ہے
خداوندا! یہ کیسی زندگی ہے
چراغِ ماہ و انجم بجھ رہے ہیں
مگر شمعِ تمنّا جل رہی ہے
پکارا ہے تری یادوں نے اکثر
خیالوں نے ترے آواز دی ہے
جلائی ہے خرد کی شمع جب سے
جنوں کی روشنی کم ہو گئی ہے
جفا پرور مجھے تیرے ستم سے
نہ جانے کیوں محبت ہو گئی ہے
نگاہِ حسن ٹھہری ہے جہاں بھی
وہیں رفتارِ عالم رُک گئی ہے

کرو مشقِ تغافل تم کہ ہم کو
جفا سہنے کی عادت ہو گئی ہے
اُلجھ جا شورشِ موجِ بلا سے
تلاطم میں حیاتِ سرمدی ہے
کوئی نغمہ اَجل کا گاؤ فاروق
مریضِ ہجر کو نیند آ رہی ہے

○

غنیؔ

شکوۂ خسروی خود ریزنی ہے
قبولِ حق فقط تر دامنی ہے
جو میں دولت پہ نازاں اُن سے کہہ دو
غنی وہ ہے کہ دِل جس کا غنی ہے

○

پروردۂ قرار

ابھی نظر مری آسودۂ بہار نہیں
ابھی جنوں کو یہ ماحول سازگار نہیں
کٹی ہے رات سِتاروں سے گفتگو کرتے
چلے بھی آؤ کہ اَب تابِ اِنتظار نہیں
ابھی ہے حُسن خود اَپنی نظر سے نامحرم
ابھی بہار کو اندازۂ بہار نہیں
یہ اُس کا لطف کہ مختارِ کل کیا ہم کو
یہ کِس کا جبر کہ خود دل پہ اِختیار نہیں
وہ کون ہے کہ نہیں جس کو آرزو تیری
وہ کون ہے جو ترے غم میں سوگوار نہیں
کِسی پہ لطف و کرم کی ہیں بارشیں فاروق
کِسی کو جبر و سِتم پر بھی اِختیار نہیں

قیصری کا چراغ

مِلا ہے منزلِ جاناں کا رہرؤں کو سُراغ
نہ کیوں ہو خاک نشینوں کا آسماں پہ دماغ

یہ کیسا دِن ہے کہ خورشید کو ترستے ہیں
یہ کیسی محفلِ شب ہے کہ بجھ رہے ہیں چراغ

کہیں وہ مطربِ ہستی نظر نہیں آتا
نَوا سے جس کی ملے عظمتِ کہن کا سُراغ

شرابِ تلخیٔ غم سے مرا سُبو بھر دے
مۓ خلوص سے خالی ہیں میکشوں کے اَیاغ

کبھی جبینِ سحر پر، کبھی دِلِ شب میں
چمک رہا ہے ازل سے مرے سُجود کا داغ

چراغِ قصرِ امارت کی لَو بتاتی ہے
لہُو سے اپنے فروزاں ہے قیصری کا چراغ

ر

اَجل نے قیدِ زمانہ سے کر دیا آزاد
قیودِ زیست میں ممکن کہاں تھا ورنہ فراغ

○

بہار و خزاں

زیست بے اعتبار ہے ساقی
نقش ناپائیدار ہے ساقی

اُس سے بیگانگی ہے کیوں آخر
جو ترا پردہ دار ہے ساقی

بُجھ رہے ہیں چراغِ منزلِ شب
رات تاریک و تار ہے ساقی

جس کو کہتے ہیں کائناتِ وجُود
کچھ خزاں کچھ بہار ہے ساقی

○

پیچ و تاب

کِس قیامت کے اِنقلاب آئے
ذرّے بَن بَن کے آفتاب آئے
جِن کی تعبیر مِل سکی نہ کبھی
ایسے ایسے بھی ہم کو خواب آئے
زِندگی میں نہیں ہے جِن کا جَواب
اُن سوالوں کے بھی جواب آئے
اُن کی محفل سے ہم نے کیا پایا
لے کے دُنیا کے اِضطراب آئے
حُسن ذرّوں کو بخشنے وَالے !
آرزؤں پہ آب و تاب آئے
اُن کی قسمت سکونِ دِل فاروق
میرے حِصّے میں پیچ و تاب آئے

گوہرِ غلطاں

ہر زخمِ خونچکاں گلِ خنداں سے کم نہیں
یہ سینۂ فگار گلستاں سے کم نہیں
کشتی ہوئی کنارے سے ٹکرا کے پاش پاش
ساحل بھی میرے واسطے طوفاں سے کم نہیں
آئینۂ حیات کو دیکھا ہے عُمر بھر
لیکن ہنوز دیدۂ حیراں سے کم نہیں
اُس شوخ کے تبسّمِ پنہاں کا ذِکر کیا
اک حرفِ دِل نواز بھی اِحساں سے کم نہیں
میرا جنوں بھی کم نہیں عہدِ بہار سے
سینے کا چاک، چاکِ گریباں سے کم نہیں
تیرا جمال ماہ و ستارہ سے بھی جمیل
تیری نگاہ گردشِ دوراں سے کم نہیں

حُسنِ فسوں طراز کی اک چشمِ التفات
دردِ حیات کے لئے درماں سے کم نہیں
میرا غمِ حیات ہے سرمایۂ حیات
میرا ہر اشک گوہرِ غلطاں سے کم نہیں

موجِ صبا

پہلا سا نہ وہ حُسن نہ پہلی سی ادا ہے
جو دل ہے وہ بیگانۂ آدابِ وفا ہے
جو دے نہ سکے تازگی افسردہ گلوں کو
بیکار وہ گلشن کے لئے موجِ صبا ہے

گردشِ جام

ادا ادا ہیں میں تبسّم نظر نظر میں پیام
مگر نگاہِ محبّت ہے آج تک بد نام
بہار یہ ہے اسی کو بہار کہتے ہیں؟
نہ ذکرِ غنچہ و گل ہے نہ دورِ بادہ و جام
یہ کیسی منزلِ شب ہے، یہ کیا عالمِ صبح؟
بجھی بجھی سی سحر ہے، اُداس اُداس سی شام
سنبھل سنبھل کے قدم رکھ حدودِ گلشن میں
چمن چمن میں ہیں کانٹے، روش روش پہ ہیں دام
حریفِ دورِ زمانہ ہے اک تبسّم شوق
جوابِ گردشِ دوراں ہے ایک گردشِ جام
خزاں نصیب بہاروں پہ ناز کیسے کروں
ہے پیشِ نظر سامنے خورشیدِ شام کا انجام

کلی کا سوز ملا ہے کسی کو گلشن میں
عطا ہوا ہے کسی کو شمیمِ گل کا خرام

○

شمعِ بزم

دلوں میں جو رکھتے ہیں عزمِ بلند
"ستاروں پہ وہ پھینکتے ہیں کمند"

نہ جب تک جلے پہلے خود شمعِ بزم
شبستاں میں ہوتی نہیں سر بلند

جو ہے درد کا اپنے خود چارہ گر
ہے کون و مکاں میں وہی ارجمند

(بہ تصرّف اقبالؔ)

○

جنونِ عشق

لٹا رہے ہیں متاعِ خرد کو فرزانے
جُنوں کو بیچتے پھرتے ہیں خود ہی دیوانے
مِثالِ سبزہ خود اپنے چمن میں بیگانے
زبانِ لالہ و گل پر ہیں جن کے افسانے
گذر کے آئے ہیں اُن منزلوں سے اہلِ جُنوں
بھٹک رہے ہیں جہاں مُدّتوں سے فرزانے
عجیب بات ہے یارو! یہ کیسا دَور آیا
کہ عہدِ گل میں بھی خالی پڑے ہیں میخانے
نہ جس نے دِل پہ حوادِث کے تیر کھائے ہوں
وہ لذّتِ غمِ سوز و گداز کیا جانے
فقیہہ شہر پہ رشوت حرام ہے لیکن
یہ اَور بات پسند آ گئے ہیں نذرانے

طلوعِ صبحِ درخشاں بجا سہی لیکن!
ثبوت کیا کہ سحر تک رہیں گے پروانے
لگا نہ ٹھیس مرے دِل کے آبگینے کو
چھلک نہ جائیں کہیں چشمِ تر کے پیمانے
مجھے گِلہ نہیں کوتاہئ طلب کا ندیم
جنونِ عشق سلامت ہزار ویرانے
تری ہنسی پہ تصدّق سکوتِ لالہ و گل
تری نگاہ پہ قرباں ہزار میخانے

○

جو خود ہی محفلِ سازش کے پیر و مرشد ہوں
وہ تیز ہوش کسی کے مُرید ہوتے ہیں؟

○

حلقۂ دام

تُو نکل گماں کے حصار سے، تُو گذر خودی کے مقام سے
یہی مُدعا ہے سجود سے، یہی مُدعا ہے قیام سے
اسے حُسن کہنا بجا نہیں، جو نہ حُسنِ آئینہ ساز ہو
اُسے عشق کہنا روا نہیں، جو ہو دُور اپنے مقام سے
مرے پاس اَپنا نِظام ہے، مرے پاس اپنا پیام ہے
مجھے کیا کسی کے پیام سے، مجھے کیا کِسی کے نِظام سے
جو نہ سَرورِی کا پیام دے، جو نہ زندگی کا پیام دے
مجھے ضِد ہے ایسی نماز سے، مجھے کَد ہے ایسے اِمام سے
رہے جامِ جم کی نہ آرزو، نہ ہَوس ہو آبحیات کی
مجھے ایک گھونٹ مِلے اگر، ترے جَامِ ماہِ تمام سے
وہ حَیات مَوت ہے بالیقیں جو کسی کے رحم وکرم پہ ہو
یہ کہا ہے طائرِ بامِ نے، اک اسیرِ حلقۂ دام سے

مری داستانِ قفس نہ کہہ، مری داستانِ ستم نہ سُن
جو بچے تھے شعلۂ برق سے، وہ جلے ہیں سوزِ تمام سے

حریفِ بہار

کلیاں اُداس پھول سبھی سینہ فگار تھے
عہدِ بہار گل پہ لیل و نہار تھے
وہ بھی ہیں آج حافظِ گلستاں کے مدعی
دورِ خزاں میں جو کہ حریفِ بہار تھے

برگ و بار

دِل کو حریفِ گردشِ دَورِ زماں بَنا
برقِ تپاں کی زَد میں نیا آشیاں بَنا

قائم ترا وجود ہے خودمیکرِ شوق سے
خودمیکرِ سنگِ دَر سے ترا آستاں بَنا

کیسا وہ دِل نہ جس میں ہو سیماب کی تڑپ
کیسا وہ دَرد جو نہ غمِ جاوداں بَنا

فرمانِ عشق، ذکرِ تغافل سے کر گریز
دِل کا یہ حکم دیدۂ تر کو زباں بَنا

نکلی جو مُنہ سے بات وہ افسانہ ہوگئی
آیا جو لب پہ حرف وہی داستاں بنا

رقصاں تھا جس پہ شوق وہ اب لَو لئے کہاں
نازاں تھا جس پہ عشق وہ نغمہ فغاں بَنا

کیوں میرے برگ وبار پہ لہرا رہی ہے برق
کیا پھر کوئی قفس میں نیا آشیاں بنا

○

گماں

شائد اسی کا نام ہے وارفتگیٔ شوق
اپنے پہ ہو رہا ہے کسی کا گماں مجھے

○

ہر فرعونے را موسیٰ

رہیں گی ہمنشیں ظلم و ستم کی بدلیاں چھٹ کر
کہ ہر فرعون کے بعد ایک موسیٰ دیکھتا ہوں میں

○

بلاکشانِ محبّت

غمِ بہار میں راہِ خزاں سے گذرے ہیں
دِلوں کے قافلے ہر امتحاں سے گذرے ہیں

جنوں کی روشنی لے کر نگاہبانِ حیات
حدودِ ظلمت و وہم و گماں سے گذرے ہیں

چراغ بن کے جلے ہیں رہِ تمنّا میں
بہار بن کے ترے گلستاں سے گذرے ہیں

وہاں نگاہِ تلاطم پہنچ نہیں سکتی
ستم کشوں کے سفینے جہاں سے گذرے ہیں

مسافرانِ حرم کو خبر نہیں اب تک
بلاکشانِ محبّت کہاں سے گذرے ہیں

تری تلاش میں دیر و حرم کا ذکر ہی کیا
تری تلاش میں ہر آستاں سے گذرے ہیں

ہمیں تو اُن کے ستم بھی گراں نہیں فاروق
مزاجِ ناز پہ شکوے گراں سے گذرے ہیں

○

داغ کی صورت

دِل ہے سینے میں داغ کی صُورت
جَل رہے ہیں چراغ کی صورت

آبگینوں سے کھیلنے والے
دِل ہے نازک ایاغ کی صورت

زِندگی سخت کشمکش انگیز
غیر ممکن فراغ کی صُورت

○

خونِ تمنّا

طلب ہم اُن کی، ہماری وہ جستجو کرتے
تمام عُمر گذاری یہ آرزو کرتے

قفس سے آئے تو شعلوں کا تذکرہ پایا
خیال یہ تھا بہاراں کی گفتگو کرتے

یہ اِجتناب مناسِب، نہیں، نہیں ساقی
زبان سُوکھ گئی ہے سُبو سُبو کرتے

اگر تھا ہم سے گِلہ بھی تو بَرملا ہوتا
اگر تھی ہم سے شکایت تو روبرو کرتے

چمن کو رنگ گلوں کو لہُو دیا ہم نے
ہم اَور کیا گل و لالہ کی آبرو کرتے

اگر مآلِ بہاراں سے باخبر ہوتے
تو ہم کبھی نہ تمنّائے رنگ و بُو کرتے

اُلجھ سکے جو نہ کانٹوں سے گلستاں کے لئے
وہ اَپنے خونِ تمنّا سے کیا وُضو کرتے
جو کر سکے نہ رَفو اَپنا پیرہن فاروق
کِسی کا چاکِ گریباں وہ کیا رَفُو کرتے

○

غم پائیدار ہے نہ خوشی پائیدار ہے
بے اِعتبارِ زندگی بھی مستعار ہے
ہے دِل ہی کائنات میں سرمایۂ حیات
دل پر ہی سوز و سازِ جہاں کا مدار ہے
جِن منزلوں پہ صبحِ درخشاں کا تھا گماں
طاری اُنھیں پہ عالمِ گرد و غبار ہے
مدّت کے بعد عشق کا ہم پر کھلا یہ راز
ہستی تمام کشمکشِ انتظار ہے

○

سرمایۂ حیات

تخلیقِ کائناتِ دگر کر سکے تو کر
پیدا خود اپنے شام و سحر کر سکے تو کر
پھولوں میں شب گذارنا مشکل نہیں کوئی
کانٹوں پہ کوئی رات بسر کر سکے تو کر
اچھا نہیں کسی کی تمنا سے کھیلنا
اچھا یہی ہے اس سے حذر کر سکے تو کر
ہر اشکِ خوں ہے مخزنِ سرمایۂ حیات
ہر اشکِ خوں کو لعل و گہر کر سکے تو کر
تارے مراحلِ سفرِ شوق ہی سہی
تاروں کو بھی شریکِ سفر کر سکے تو کر
عقل و خرد کے مرحلے طے کر لئے تو کیا
وہم و گماں کے معرکے سر کر سکے تو کر

فاروق یہ بہارِ چمن پھر نہ آئے گی
یارانِ میکدہ کو خبر کر سکے تو کر

○

خُم و کاکُل

صبا گل ریز جاں پرور فضا ہے
یہ موسم اور ویران میکدہ ہے

گرفتارِ خم و کاکل ہے کوئی
غمِ دوراں میں کوئی مبتلا ہے

نہیں ہے بے وفائی کی شکایت
تمہاری کم نگاہی کا گلہ ہے

رہِ ہستی سے مرگِ ناگہاں تک
فقط دو ہی قدم کا فاصلہ ہے

یہ دُنیا امتحاں گاہِ محبّت
یہ دُنیا حاصلِ کرب و بلا ہے

بدل ڈالا نظامِ جان و دل کو
یہ سب میرے جنوں کا حوصلہ ہے

○

شکستِ ساز

ہجومِ درد میں غم ہی مرا دمساز ہوتا ہے
یہی ہمدرد ہوتا ہے، یہی ہمراز ہوتا ہے
کوئی معجز نما جب زمزمہ پرداز ہوتا ہے
جہاں کا ذرّہ ذرّہ گوش بر آواز ہوتا ہے
سفینوں کو خدا محفوظ رکھے ناخداؤں سے
وہی اکثر ڈبو دیتے ہیں جن پر ناز ہوتا ہے
کسی کی کم نگاہی بھی پیامِ ناز دیتی ہے
کسی کی بے نیازی میں بھی کوئی راز ہوتا ہے
عروجِ ماہ و انجم کی خبر لاتے ہیں جا جا کر
وہ طائر جن کو علمِ عظمتِ پرواز ہوتا ہے
جنون و جذب میں ایسے بھی کچھ لمحات آتے ہیں
جو نغمہ لب پہ آتا ہے شکستِ ساز ہوتا ہے

ہے جن پہ نازِ ساقی کو، وہ رندانِ ہم ہیں
ہمارے دم سے دورِ جام کا آغاز ہوتا ہے

جذبِ دل

وہ ستم پرور بچشمِ اشکبار آ ہی گیا
چاک دامانی پہ میری اُس کو پیار آ ہی گیا

مٹتے مٹتے مٹ گئی جانِ وفا کی آرزو
آتے آتے بے قراری کو قرار آ ہی گیا

چُپکے چُپکے مجھ پہ میری خامشی ہنستی رہی
روتے روتے جذبِ دل پر اختیار آ ہی گیا

کوئی وعدہ جس کا معنی آشنا ہوتا نہیں
پھر اُسی وعدہ شکن پر اعتبار آ ہی گیا

یاالٰہی جذبۂ ہوش و خرد کی خیر ہو
منتظر جس کا جنوں تھا وہ دیار آ ہی گیا

خندۂ گل

ہے زلفِ گرہ گیر میں پہلا سا کہاں خم
اب حسنِ فسوں کار کا ہے اور ہی عالم

پھولوں کے تبسّم پہ نہ جا صحنِ چمن میں
ہر خندۂ گل میں ہے نہاں گریۂ شبنم

میں عجز کا پیکر ہوں تو وہ نازِ سراپا
میں دردِ مکمّل ہوں تو وہ شعرِ مجسّم

فردوس بداماں ہے کسی شوخ کی دُنیا
کانٹوں سے مزیّن ہے مرے شوق کا عالم

کیا جانئے کیا ہو گیا احساسِ وفا کو
وہ دامنِ نمناک نہ وہ دیدۂ پُر نم

موجوں کے لئے موت ہے ساحل کی تمنّا
ہر زخمِ تمنّا کے لئے زہر ہے مرہم

کب تک میں پریشان رہوں اے غمِ جاناں
ہیں تیرے سوا اور بھی دُنیا میں کئی غم

○

نگہِ نیم باز

واقف نہ تھے جو عظمتِ دار و رسن سے بھی
کتنی عجیب بات کہ منصور ہو گئے

جتنے بڑھے ہیں منزلِ تہذیب کی طرف
اُتنے ہی راہِ لطف سے ہم دُور ہو گئے

دیکھا کچھ اس طرح نگہِ نیم باز نے
ہم بے پیئے ہی بزم میں مخمور ہو گئے

○

لیلیٰ شب

آپ نے جانِ جہاں رختِ سفر باندھ لیا
لیلیٰ شب نے سنوارے ابھی گیسو بھی نہیں

ہے یہی زیست تو اس زیست سے حاصل کیا ہے
نغمۂ ساز نہیں، مے بھی نہیں، تو بھی نہیں

کون آیا ہے شبِ ماہ میں پیمانہ بدوش
جام کی بات نہیں ذکرِ لبِ جو بھی نہیں

لے اُڑی موجِ خزاں رنگ و بہارِ گلشن
ناز کلیوں میں نہیں، پھول میں خوشبو بھی نہیں

تُو نہیں ہے تو گلستاں میں کہاں رعنائی
رات کے شوخ نظاروں میں وہ جادو بھی نہیں

ہم نے یہ جبر کے انداز بھی دیکھے فاروق
دل میں طوفانِ الم آنکھ میں آنسو بھی نہیں

ذکرِ بہاراں

سامانِ اہتمامِ چراغاں ابھی نہیں
محفوظ بجلیوں سے گلستاں ابھی نہیں

میرا نصیب ہیں غمِ دَوراں کی تلخیاں
میرے نصیب میں غمِ جاناں اَبھی نہیں

کہتے ہیں لب کہ چھیڑ فسانے بہار کے
کہتی ہے آنکھ ذکرِ بہاراں ابھی نہیں

ابتک خزاں رسیدہ ہے صبحِ بہارِ نو
آسودۂ بہارِ گلستاں ابھی نہیں

ہر لب پہ ہے نظارۂ سَاحل کی گفتگو
دِل رازدارِ لذّتِ طوفاں ابھی نہیں

گو صبح ہو چکی ہے، اندھیرا ہنوز ہے
کچھ اعتبارِ صبحِ درخشاں ابھی نہیں

فاروق کوئی جشنِ چراغاں منائے کیا
دِل بے نیازِ بارِ شہیداں ابھی نہیں

○

نخلِ تمنّا

وہ کبھی طوفاں میں ساحل آشنا ہوتا نہیں
اپنی کشتی کا جو خود ہی ناخدا ہوتا نہیں

فیصلہ کرتے تھے جو تقدیرِ روم و شام کے
اپنی قسمت کا بھی اُن سے فیصلہ ہوتا نہیں

ھائے وہ دردِ ستم ہوتی نہیں جسکی دوا
ھائے وہ نخلِ تمنّا جو ہرا ہوتا نہیں

○

برقِ تبسّم

اے چشمِ فسوں ساز سلامت ترا بادہ
اے ساقیٔ بدمست کرم اور زیادہ
ذکرِ مہ و انجم ہے نہ ہے تذکرۂ گل
یہ کیسی بہاریں ہیں کہ ساقی ہے نہ بادہ
کب تک غمِ دوراں میں گرفتار رہوں میں
اے زلفِ گرہ گیر بتا اپنا ارادہ
مسدود ہیں اس عہد میں اخلاص کی راہیں
پُر پیچ ہے اس دور میں اخلاق کا جادہ
پہنا ہے کہیں جبّہ و دستار ہوس نے
اوڑھا ہے کہیں زہد و تقدّس کا لبادہ
لوٹا ہے مرے گلشنِ راحت کو انہی نے
فاروق جو صورت سے نظر آتے تھے سادہ

گرمیٔ محفل

رہروِ ہستی وہ کیا جس کو غمِ منزل نہ ہو
زندگی بے لطف ہو جائے اگر مشکل نہ ہو
اِس شبستانِ جہاں میں شمع کی تقلید کر
صورتِ پروانہ ہرگز گرمیٔ محفل نہ ہو
عقل کہتی ہے حدِ ساحل سے طوفانوں کو دیکھ
عشق کہتا ہے کبھی منّت کشِ ساحل نہ ہو
آرزوؤں کو مری ٹھکرا نہ اے بندہ نواز
جس کو تُو ذرّہ سمجھتا ہے کسی کا دِل نہ ہو

جذب و جنوں

گلہ کیا ہو خدایانِ قفس سے
شکایت ہے نگاہِ نیم رس سے

وہ عقدے حل کئے جذب و جنوں نے
جو باہر تھے خرد کی دسترس سے

کبھی آہوں سے بھی اُٹھتے ہیں شعلے
کبھی رُکتے ہیں طوفاں خار و خس سے

یہی ہے آدمیت کا تقاضا
گذر جا منزلِ حرص و ہوس سے

کوئی لے کر چلا ہے عزمِ راسخ
پتہ ملتا ہے آوازِ جرس سے

نہیں لاتا جفا پر حرف کوئی
وفا بدنام ہے لاکھوں برس سے

جلا ڈالیں نہ قصرِ خواجگی کو
جو شعلے اُٹھنے والے ہیں قفس سے

○

اَسرارِ کائنات

منزل یہاں نہیں ہے کسی کی نگاہ میں
خود قافلے بھٹک سے گئے گردِ راہ میں

اسرارِ کائناتِ محبّت ہیں ہم پہ فاش
کیا کچھ نہیں ہے اہلِ نظر کی نگاہ میں

صبحِ طرب میں جن کی رفاقت پہ ناز تھا
آئے نہ کام وہ مری شامِ سیاہ میں

○

خودنمائی

ہم پہ اِلزام بے وفائی کے
ہائے انداز دِل رُبائی کے
اُن کے ہاتھ آگئی جہانداری
وہ جو قابِل نہ تھے گدائی کے
کارواں کو اُن ہی نے لُوٹا ہے
شور تھے جن کی رہنمائی کے
ہم ہیں عجز ونیاز کی تصویر
آپ پیکر ہیں خود نمائی کے
اُن کے دامن بھی داغ دار مِلے
جن کو دعوے تھے پارسائی کے
ہم سے پوچھو کہ کیا ہے لذّتِ غم
ہم نے جھیلے ہیں دُکھ جُدائی کے

ہم نے کاٹی ہیں ہجر کی راتیں
ہم نے دیکھے ہیں دِن جُدائی کے
اِن خدایانِ جبر کو فاروق
زعم کتنے ہیں کبریائی کے

○

اِنقلابِ نو

جور و ستم کا اب وہ زمانہ چلا گیا
اے باغباں تو اپنے گریباں کی خیر مانگ
ہیں یہ انقلابِ نو کی علامت یہ بجلیاں
ان بجلیوں سے اپنے گلستاں کی خیر مانگ

○

شعرِ مجسّم

۱ ذوقِ نظر کے ساغر چھلکے
موتی بن کر آنسو ڈھلکے
بُجھ گئی پھر اُمیّد کی شمع
ڈوب گیا خورشید نکل کے
خیر ہو یارب دین و دِل کی
آئے ہیں رہزن بھیس بدل کے
ہاتھ سے چھوٹی آس کی مینا
ٹوٹے ساغر عزم و عمل کے
اُن کی صورت شعرِ مجسّم
باتوں میں انداز غزل کے
بیت گیا پھر اب کے ساون
رہ گئے پھر ارمان مچل کے

نغموں میں وہ سوز نہیں ہے
دیکھ لئے سب ساز بدل کے
باتوں میں رس امرت جیسا
نازوں میں انداز کنول کے

سرچشمۂ افکار

یہ دل گنجینۂ اسرار بھی ہے
یہ دل سرچشمۂ افکار بھی ہے
نہیں ہیں ظلمتیں ہی دل پہ غالب
یہ سینہ عالمِ انوار بھی ہے

سازِ غمِ حیات

عشق ہے رہ نوردِ شوق عرصۂ کائنات میں
حُسن کی شوخیوں کو دیکھ رسمِ تکلّفات میں

شوق ہے سازِ دلنواز، عشق ہے سوزِ دلگداز
عقل وخرد کا کام کیا، دِل کے معاملات میں

آج ہیں گام گام پر حرص وہوس کے بُتکدے
ایک بھی بُت شکن نہیں، بتکدۂ حیات میں

سینۂ ماہتاب ہے میکرہی غم سے داغ داغ
ہیں مرے دِل کی دھڑکنیں سازِ غمِ حیات میں

نعرۂ غزنوی کا پھر گوشِ جہاں ہے منتظر
دیر سے اک سکوت ہے گنبدِ سومنات میں

کس کی نگاہِ لطف نے چھین لیا مرا سکون
لُوٹ لیا ہے کس نے دِل، پردۂ التفات میں

چھٹ کے رہیں گی ایک دِن غم کی سیاہ بدلیاں
چاند کبھی تو آئے گا میری سیاہ رات میں

○

عہدِ پُر خروش

اس عہدِ پُر خروش میں آسودگی کہاں
ہر ذرّہ ہے متاعِ بیاباں لئے ہوئے
قطروں میں ہیں تلاطمِ قلزم کی شورشیں
ہے موج موج وسعتِ طوفاں لئے ہوئے

○

حرفِ جنوں

یہ راز کِس سے بتاؤں، یہ بات کِس سے کہوں
حدیثِ شوق کا عنواں ہے ایک حرفِ جنوں
غبارِ راہ کو منزل کا نام دُوں کیسے؟
خِزاں کو صبحِ بہاراں میں کس طرح سمجھوں
جب اِعتبار نہیں خود نِگاہ پر اپنی
میں کم نِگاہئ ساقی کا ذکر کیسے کروں؟
تمام عُمر اِسی اِنتظار میں گذری
میں اُن سے حرفِ تمنّا ابھی کہوں نہ کہوں
اَدا اَدا میں کسی کی پیام و شوق و طلب
نظر نظر میں کسی کی فسانہ و افسوں
نہ ہم جلیس ہی رہبر، نہ ہم قدم راہی
میں کس کو خِضر کہوں، کس کو رازداں سمجھوں

چمن کو لوٹ رہے ہیں چمن کے رکھوالے
کوئی بتائے میں سازِ بہار کیا چھیڑوں؟!

○

تارِ رفو

نہ شوق و جستجو باقی نہ سوزِ آرزو باقی
نہ ساقی ہے نہ مینا ہے نہ وہ جامِ سبو باقی
نگاہِ لطف نے تیری ہزاروں چاک سی ڈالے
مرا دامن رہا بیگانۂ تارِ رفو باقی

○

تارِ نظر

کیا مجھ کو غرض کشمکشِ شام و سحر سے
گزریں گے مہ و مہر مری راہگذر سے
کب زخمِ نظر ہوتا ہے شرمندۂ مرہم
سو چاک رفو ہوتے ہیں اک تارِ نظر سے
ٹوٹے ہیں زمانے کے ستم میرے ہی سر پر
ٹپکا ہے مرا خونِ جگر دیدۂ تر سے
اِس دِل پہ ہیں پہلے سے کئی زخمِ تغافل
دیکھے نہ ہمیں کوئی محبّت کی نظر سے
وہ اشک حریفِ مہ و انجم نہیں ہوتا
جس اشک کو سینچیں نہ کبھی خونِ جگر سے
گردش میں کہیں ساغر و پیمانہ و خُم ہیں
یا بزمِ طرب میں کوئی اک گھونٹ کو ترسے

ملتا ہے کتابوں میں کہیں نسخۂ ہستی ؟
ہاتھ آیا کبھی سوزِ دروں علم و ہنر سے
فاروق حقیقت ہے کہ اک اشکِ ندامت
قیمت میں گراں تر ہے کہیں لعل و گہر سے

گیسوئے یار

چمن اداس، کلی مضطرب، صبا خاموش
خزاں لباسِ بہاراں بدل کے آئی ہے
بتا رہا ہے یہ نازِ شمیمِ لالہ و گل
چرا کے نکہتِ گیسوئے یار لائی ہے

حلقۂ دوراں

اے زلفِ بتاں تیرے پرستار رہے ہم
گو حلقۂ دوراں میں گرفتار رہے ہم

ہم آتشِ نمرود میں بھی غنچہ فشاں تھے
پاداشِ جنوں میں بھی سرِ دار رہے ہم

بھٹکے ہوئے راہی کو دکھائی رہِ منزل
روندی ہوئی مخلوق کے سالار رہے ہم

سینے سے لگایا ہے تجھے اے غمِ جاناں
ہر دور میں تیرے ہی طلبگار رہے ہم

تیرے لئے دُنیا کے سہے سیکڑوں آلام
تیرے لئے لذّت کشِ آزار رہے ہم

دُنیا کو رہی غنچۂ تازہ کی تمنّا
گُل ہائے فسردہ کے خریدار رہے ہم

فاروق نہ پوچھ آہ ستم خیزیٔ ایّام
ناکردہ گناہوں کے گنہگار رہے ہم

○

سُرخیٔ خونِ شہیداں

ہیں بہت خانماں برباد ابھی تک فاروق
سیکڑوں چاکِ گریباں ہیں ابھی تک باقی
مئے گُلرنگ کے ان بادہ کشوں سے کہہ دو
سُرخیٔ خونِ شہیداں ہے ابھی تک باقی

○

شعلۂ حُسن

اَشک افراطِ طرب میں بھی ڈھلک جاتے ہیں
تُند صہبا ہو تو خود جام چھلک جاتے ہیں

تیری یادوں سے مہک اٹھتا ہے ویرانۂ دِل
تیری زلفوں سے شب و روز مہک جاتے ہیں

مری تقدیر کے انجم بھی نہ چمکے شب ماہ
خاک کے ذرّے شعاعوں سے چمک جاتے ہیں

حسن لیلائے امارت کی پھبن ایسی ہے
پارساؤں کے بھی ایمان لچک جاتے ہیں

بادہ آشام بہکتے نہیں مے نوشی سے
ایک دو گھونٹ میں کم ظرف بہک جاتے ہیں

ہائے وہ برہمئ دوست کا عالم فاروق
شعلۂ حُسن سے رُخسار دمک جاتے ہیں

تیشۂ فرہاد

شیوۂ لطف پہ مائل ابھی صیاد نہیں
اور ہم ہیں کہ نہیں واقفِ فریاد ابھی

کتنے سینوں میں مچلتی ہے تری یادِ وفا
کتنے ارماں ہیں جو کرتے ہیں تجھے یاد ابھی

اہلِ ہمّت نے پہاڑوں کے جگر چیر دیئے
آپ ہیں منتظرِ تیشۂ فرہاد ابھی

تیری دانش میں گیا دورِ خدایانِ ستم
میری دانست ہیں باقیٔ بیداد ابھی

پھر اسیرانِ گلستاں پہ ستم ٹوٹ پڑے
تشنۂ جنبشِ لب تھی مری روداد ابھی

تم ہی تنہا نہیں بربادِ تمنّا فاروق
سیکڑوں اور بھی ہیں خانماں برباد ابھی

آبگینے

تری قسمت مسرّت کے خزینے
مری پلکوں پہ اشکوں کے نگینے
جو ڈوبے تھے تلاطم خیزیوں میں
وہی اُبھر ہیں ساحل سے سفینے
اُدھر ہیں سخت آدابِ محبّت
اِدھر نازک دِلوں کے آبگینے
صبا کیا جانیے کیا کہہ کے گذری
گریباں چاک کر ڈالا کلی نے
یم دوراں کی موجوں پر گراں ہیں
شکستہ آرزوؤں کے سفینے
بھر آیا ناگہاں حسرت بھرا دِل
محبّت سے پکارا جب کسی نے

مجھے رُسوا کیا بزمِ جہاں میں
خود اپنے شوق کی صورت گری نے
بڑی مشکل سے آتے ہیں آتے ہیں دلوں کو
تب و تابِ محبّت کے قرینے
یہی سرمایۂ اہلِ جنوں ہے
دھڑکتے دِل فغاں لبریز سینے

○

دردِ ملّت ہے جو مجھ سے کہلوا لیتا ہے شعر
مایۂ نازش نہیں ہے شاعری میرے لئے

○

فاروق ہو گا کل وہی منزل سے ہمکنار
جو وادئ حیات میں گرمِ سفر ہے آج

○

بہار آئی ہے

شرابِ تلخ پلاؤ بہار آئی ہے
لگی دِلوں کی بجھاؤ بہار آئی ہے
خزاں کے دَور میں گذری ہے جو اسیروں پر
وہ بات لب پہ نہ لاؤ بہار آئی ہے
ہزار زخم ہوں دل پر مگر بپاسِ نشاط
غزل بہار کی گاؤ بہار آئی ہے
کرو نہ غم کہ زمانہ ہے بر سرِ پیکار
رَوِش رَوِش کو سجاؤ بہار آئی ہے
نسیم آئی ہے گلشن میں رنگ و بُو لیکر
ابھی چمن سے نہ جاؤ بہار آئی ہے
چمن میں جھوم کے ہر سُو بسنت رُت آئی
مچل کے آؤ گھٹاؤ بہار آئی ہے

نئی شراب، نئی انجمن، نئے ساقی
نیا خمار بھی لاؤ بہار آئی ہے
خرد کی شمع جلانے سے فائدہ فاروق
جنوں کے دیپ جلاؤ بہار آئی ہے

○

موت ہے نام فقط روح کی آزادی کا
میری دانست میں موت اس کے سوا کچھ بھی نہیں

○

بہت دنوں سے ہے تیغِ زمانہ تشنۂ خوں
کہاں ہیں اہلِ جنوں پیش جو گلو کرتے

○

برقِ حوادث

تری نظر میں مرا عشق جارحانہ تھا
مری نظر میں ترا حُسن آمرانہ تھا

گری ہے برقِ حوادث اسی گلستاں پر
ہزار حیف جہاں میرا آشیانہ تھا

سُنائے کیا غمِ ہستی کی داستاں کوئی
ازل سے میرا مقدّر غمِ زمانہ تھا

مری نظر کو نہ الزام دو جہاں والو
نگاہِ شوخ کا انداز ساحرانہ تھا

یہی قصور ہے میرا یہی خطا میری
کہ رنگ و بُو سے مجھے عشقِ والہانہ تھا

نہ سُن سکی جسے دُنیا وہ داستاں تھی مری
رہا جو تشنۂ لب وہ مرا فسانہ تھا

اے دوست

جَلا نہ دے کہیں ایوانِ خواجگی اے دوست
سُلگ رہی ہے دِلوں میں جو آگ سی اے دوست

ترے بغیر بہاروں میں کیف بھی تو نہیں
ترے بغیر کہاں لطفِ زندگی اے دوست

شراب و سَاغر و مینا پہ اِختیار اُن کا
نہیں جو واقفِ آدابِ میکشی اے دوست

بڑی تلاش سے مِلتا ہے آدمی کو جنوں
بڑی تلاش سے مِلتا ہے آدمی اے دوست

سُرورِ بادۂ رنگیں فراق میں تیرے؟
ترے خیال میں پھولوں کی دل کشی اے دوست!

ہزار بار بہار و خزاں نے رُخ بَدلے
وہی ہے گردشِ دَوراں کی برہمی اے دوست

کہاں ہے عشق میں فاروق سوز و سازِ کہن
کہاں وہ حُسن میں اندازِ دلبری اے دوست

○

فریبِ آرزو

پھول کی خواہش پہ ہم کانٹوں میں اُلجھائے گئے
دیکھئے کتنے فریبِ آرزو کھائے گئے

وحشیانہ دور کی اُن تلخ باتوں کو نہ چھیڑ
وقت تھا، ایام تھے، لمحات تھے، آئے گئے

○

جذبِ کلیمانہ

افکار میں وہ رنگِ حکیمانہ نہیں ہے
وہ جذبِ کہن سوزِ کلیمانہ نہیں ہے
ساقی میں وہ انداز کہاں ساقی گری کے
رندوں میں وہ سرمستیٔ رندانہ نہیں ہے
یا میرے لئے تھی کبھی دُنیائے تگ و تاز
یا میرے جنُوں کیلئے ویرانہ نہیں ہے
اے شمع ترے سوزِ شبستاں کو ہُوا کیا
پروانوں میں وہ جرأتِ پروانہ نہیں ہے
ہر چند نہیں لب پہ ترا ذکرِ جنُوں خیز
دِل پھر بھی تری یاد سے بیگانہ نہیں ہے
فرزانے ہی فرزانے ہیں اب دشتِ جنوں میں
نازاں تھا جنوں جس پہ وہ دیوانہ نہیں ہے

جو تُند ہو نشۓ میں وہ بادہ نہیں مِلتا
ہو جس میں مۓ تلخ وہ پیمانہ نہیں ہے

سوزِ نمرود

مِٹ گۓ نقشِ حقیقت کو مِٹانے والے
بُجھ گۓ حق کے چراغوں کو بجھانے والے

سوزِ نمرود ہے کیا عشقِ خلیلی کی قسم
جل گۓ آگ میں اوروں کو جلانے والے

کیا قیامت ہے کہ مظلوم نظر آتے ہیں
غم ہر اک ملّتِ مظلوم کا کھانے والے

بنتے پھرتے ہیں سخن گستر و افسانہ نگار
سُرخیاں میرے فسانے کی اُڑانے والے

تلاش

تجھے راحتوں کی ہے آرزو، مجھے مشکلوں کی تلاش ہے
مجھے رزمگاہ سے عشق ہے، تجھے محفلوں کی تلاش ہے
تُو فریب خوردۂ شوق ہے، مَیں شہیدِ خنجرِ درد ہُوں
تجھے خوں بہا کی ہے آرزو، مجھے قاتلوں کی تلاش ہے
جو چراغِ ظلم بجھا سکے، مجھے اُس جنوں کی ہے آرزو
جو فسردہ دیپ جلا سکیں، مجھے اُن دلوں کی تلاش ہے
جنھیں موجِ غم سے گریز تھا، وہ حریفِ سیلِ بلا ہوئے
جو پلے تھے قلزمِ موج میں، انھیں ساحلوں کی تلاش ہے
وہ تلاشِ خضر کریں گے کیا، جو ہوں آپ اپنے ہی رہنما
وہ میانِ راہ رکیں گے کیا، جنھیں منزلوں کی تلاش ہے

نظمِ ہستی

سامنے آئینۂ شام و سحر رکھتے ہیں ہم
زندگی کے ہر تغیّر پر نظر رکھتے ہیں ہم

پھونک ڈالے گا جو اک دن قصرِ استبداد کو
اپنی خاکستر میں ایسا بھی شرر رکھتے ہیں ہم

شورشِ موجِ حوادث کا ہو کیوں خطرہ ہمیں
زادۂ طوفاں ہیں طوفانوں میں گھر رکھتے ہیں ہم

آئے گا دورِ خزاں کے بعد پھر عہدِ بہار
شامِ غم کے بعد ارمانِ سحر رکھتے ہیں ہم

لاکھ ہوں فاروقؔ ہم بیگانۂ اسرارِ دہر
نظمِ ہستی کی بہر صورت خبر رکھتے ہیں ہم

سوزِ نہاں

زباں اپنی ، نہ دِل اَپنا، نہ اندازِ بیاں اَپنا
فغاں اَپنی، نہ غم اَپنا، نہ دَورِ آسماں اَپنا

رَہی ہے بجلیوں سے روشنی اپنے گلستاں میں
رَہا ہے بجلیوں کی زَد میں برسوں آشیاں اَپنا

جھلکتا ہے ہمارا خونِ حَسرت لالہ زاروں میں
سُلگتا ہے دلِ خورشید میں سوزِ نہاں اَپنا

نہ چھیڑو نغمۂ شوق و طلب سازِ مسرّت پر
ابھی تو زخم تازہ ہیں، ابھی غم ہے جواں اَپنا

جبینِ شوق پر پابندئی دیر و حَرم کیسی
جبینِ شوق خود ہی ڈھونڈ لے گی آستاں اَپنا

لَرزتی سی زباں کہتی ہے اَپنے قصۂ غم کو
فسانہ دَرد کا کہتا ہے اشکِ خونفشاں اَپنا

کسی ظالم کو ہم فاروقِ اپنا راز داں سمجھے
کسی نامہرباں کو ہم نے سمجھا مہرباں اپنا

○

اہلِ خرد

سکوتِ درد کو سمجھیں گے کیا فسانہ طراز
نگاہِ شوق کو حسنِ ایاز کیا جانے

لپٹ رہی ہیں اُجالوں سے ظلمتیں شب کی
اُلجھ رہے ہیں حقائق سے اب بھی افسانے

یہ راز اہلِ خرد کو ابھی نہیں معلوم
جنوں خود آئے گا اہلِ خرد کو سمجھانے

○

سائے

وہ نہیں آئے بڑھ گئے سائے
جن کی آس پر دیپ جلائے
دُکھ میں کوئی کام نہ آئے
دیکھ لئے سب اَپنے پرائے
اُن دیپوں پر رونا آیا
جو رَوشن نہ ہونے پائے
یہ برکھا رُت کیسی آئی
پھُولوں کے چہرے سنولائے
کِتنے چاند زمیں کی خاطر
چاندنی راتوں میں گہنائے
ساون میں گھر اپنا جلا تھا
گیت کوئی ساون کے نہ گائے

کوئی جئے اُمید پہ کب تک
سپنوں سے کیوں جی بہلائے؟
فرقت کی شب رو کر کاٹی
ہجر کے دِن آئے گجلائے

○

تعمیرِ کعبہ

برق کو لاگ رہی ہے مرے کاشانے سے
کعبہ تعمیر ہوا کرتا ہے بتخانے سے
یہ حقیقت ہے کہ اس بزم کی رونق میں ہوں
سونی ہو جائے گی دنیا مرے اُٹھ جانے سے

○

تلاطم

مزدور کی دُنیا میں تلاطم ہی تلاطم
آزاد کی دُنیا میں ضیا بارئ انجم
نادار کی راتوں میں اَندھیرا ہی اَندھیرا
زَردار کی راتوں میں ضیا بارئ انجم
اک وہ ہیں کہ تقدیر میں نغمات ہی نغمات
اک وہ ہیں کہ آفاق میں محبوسِ تکلمُ
لرزاں ہیں کسی آنکھ میں نمناک سِتارے
رَقصاں ہیں کسی لب پہ طرب ناک تبسّمُ
مِٹ جائے گی یہ حَاکم و محکوم کی تفریق
جس دِن بھی ہُوا بندہ و آقا میں تصادم
اُٹھنے کو ہے سرمایہ پرستی کا جنازہ
مِٹنے کو ہے فاروق سلاطین کا تحکّمُ

صبحِ بہار

کچھ اِس انداز سے محبوبۂ عہدِ بہار آئی
مجھے یاد اپنے ویرانے کی آئی، بار بار آئی

صبا آوارہ، گُل افسردہ، ذوق و شوق پژمردہ
یہ عالم تھا مرے گلشن میں جب صبحِ بہار آئی

جفا کیشی تری عادت، وفا کیشی مری فطرت
وہ تجھ کو سازگار آئی یہ مجھ کو سازگار آئی

چمن والے مرے ذوقِ طلب کو پا نہیں سکتے
وہ کہتے ہیں خزاں آئی، میں کہتا ہوں بہار آئی

نگاہِ شوق نے ڈھونڈا تجھے ہر لالہ و گُل میں
زبانِ آرزو صحنِ گلستاں میں پکار آئی

ہمارا تذکرہ کیا ہم تو ہیں آوارۂ ہستی
نسیمِ صبح بھی محفل سے اُن کی بیقرار آئی

نقشِ قدم

عِشق کو بیگانۂ دیر و حرم دیکھا کئے
رَہروِ ہستی ترا نقشِ قدم دیکھا کئے

پا لیا اہلِ جنوں نے منزلِ مقصود کو
کارواں سے رَہ گئے جو پیچ و خم دیکھا کئے

برہمن کو دَرد سے نا آشنا پایا گیا
شیخ کو بیگانۂ لطف و کرم دیکھا کئے

رزمگاہِ زندگی میں قیصر و کسریٰ کے سَر
غازیانِ عشق کے زیرِ قدم دیکھا کئے

غم گُساران جہاں خوفِ ستم رکھتے نہیں
دَردمندوں کے یہی انداز ہم دیکھا کئے

دِل کے آئینے میں اے فاروق ہم شام و سحر
بادہ و ساغر، حریفِ جامِ جم دیکھا کئے

ساقی گری اپنی

نہ کر سکتے ملائک بھی جہاں میں ہمسری اپنی
اگر حرص ہوس سے پاک ہوتی بندگی اپنی

یہ جینا بھی کوئی جینا ہے یارب تیری دُنیا میں
نہ صبحِ زندگی اپنی، نہ شامِ زندگی اپنی

ہُوا برباد گلشن باغباں کی کم نگاہی سے
خزاں نے لُوٹ لی آکر بہارِ زندگی اپنی

سمجھتا کیوں نیازِ عشق کو اندازِ خود بینی
اُدھر خوئے تکلّف تھی اِدھر تھی سادگی اپنی

مِرے جذبِ محبّت کا تماشا دیکھنے والو!
بنے گی حاصلِ ہستی یہی دیوانگی اپنی

تری محفل میں ساقی آج ہم محرومِ بادہ ہیں
کبھی سرمایۂ محفل تھی یا ساقی گری اپنی

زیرِ دام

اُٹھ گئے جب بادہ کش گردش میں جام آیا تو کیا
اَب کوئی لے کر شرابِ لالہ فام آیا تو کیا

میری محفل میں وہ میرا ماہتاب آیا نہیں
کہکشاں کی بزم میں ماہِ تمام آیا تو کیا

ہو گئی محروم جب ذوقِ تماشہ سے نظر
بے حجابانہ کوئی بالائے بام آیا تو کیا

قافلے والے ہی جب نظروں سے اوجھل ہو گئے
جادۂ ہستی میں کوئی تیز گام آیا تو کیا

ہائے اُس جانِ تغافل کا یہ کہنا ناز سے
میرے دیوانے کے لب پر میرا نام آیا تو کیا

ہم ہی جب بیگانۂ صہبا و مینا ہو گئے
اَب کوئی مینا بکف، آتش بجام آیا تو کیا

جس کی خاطر ہم نے دامِ قید کو ترجیح دی
وہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی زیرِ دام آیا تو کیا
زندگی بھر مجھ سے وہ ظالم جو بیگانہ رہا
میرے مر جانے کے بعد اُس کا پیام آیا تو کیا

○

فکرِ حکیمانہ

نہ بادہ ہے، نہ مینا ہے، نہ ساغر ہے، نہ پیمانہ
نئی محفل، نئے ساقی، نئے آدابِ میخانہ
دیارِ عشق میں آئے کوئی جذب و جنوں لے کر
حریمِ ناز میں آئے کوئی پھر بے حجابانہ
خزاں کا دور ہی اچھا تھا اِس عہدِ بہاراں سے
بہت بہتر تھا شہرِ رنگ و بُو سے اپنا ویرانہ

طلسمِ سامری ٹوٹے تو آخر کس طرح ٹوٹے!
نہ وہ فکرِ حکیمانہ ، نہ وہ ذوقِ کلیمانہ
مرا ذوقِ نظر صدیوں رہا سرمایۂ محفل
مرا خونِ جگر برسوں رہا عنوانِ افسانہ
خرد مندی کی باتیں مجھ کو راس آتیں تو کیوں آتیں؟
مرا مشرب تھا سرمستی مرا مسلک ہے رندانہ
ابھی تک دھندلے دھندلے ہیں چراغِ صبح کے جلوے
ابھی ہے گیسوئے لیلائے شب منت کشِ شانہ
جسے دنیا سمجھتے تھے وہ اک حیرت کدہ نکلا
جسے ہم جامِ جم سمجھے وہ تھا عکسِ سیہ خانہ

○

یہ دورِ جنوں ہے وہ پیرہن کیسا
جو چاک چاک نہیں ہے، جو تار تار نہیں

○

حرف جنوں

بشیر فاروق

کا

دوسرا مجموعۂ کلام

”مینائے غزل،، کے بعد عنقریب بشیر فاروق کا دوسرا مجموعہ کلام۔ ”حرف جنوں،، آپکے ذوق کی تسکین کیلئے اشاعت پزیر ہو رہا ہے۔ جسمیں روح پرو ادبی نظمیں۔ طنز آمیز سیاسی قطعے۔ اور پرسوز و پر غزلیں بے نظیر بندش کے ساتھ دلکش پرتکلف انداز میں پیش ہونگی۔ جو یقیناً اردو ادب میں گراں بہا اض اور دنیائے شعر و سخن میں مایۂ ناز شاہکار متصور ہونگی۔

مکتبہ لالہ‌زار کراچی

MAKTABA-E-LALAZAR

KARACHI